جموں و کشمیر کے منتخب افسانہ نگاروں کا فکری مطالعہ

(بحوالہ خصوصی ہندو مسلم افسانہ نگاروں کے حوالے سے)

تحقیقی مقالہ برائے ایم-ایس (اُردو)

محقق

رفعت بانو

رجسٹریشن نمبر:234-FLL/MSURDU/F17

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو

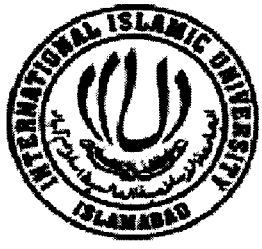

شعبہ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Accession No TH2 3473

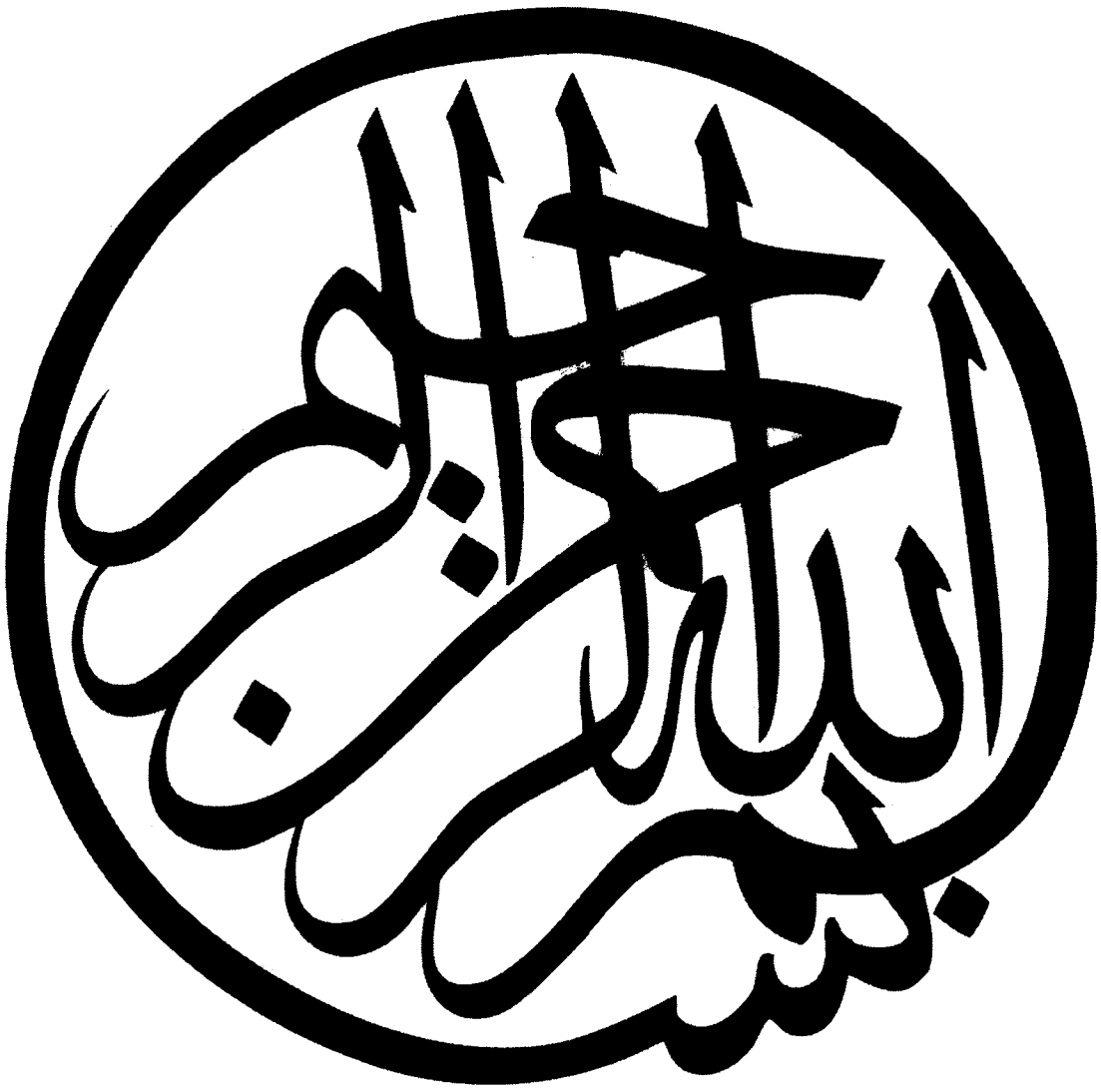

B266919

Rupees 50 — ۵۰ روپیہ

بیان حلفی

مسماۃ ---رفعت بانو---ولدیت---غلام محی الدین لون رجسٹریشن نمبر 234-FLL/MSUrdu/F17

شعبہ اردو (خواتین) بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد برائے ---ایم - ایس---- کی

سکالر ہونے کی حیثیت سے اپنا مقالہ بعنوان جموں و کشمیر کے منتخب افسانہ نگاروں کا فکری مطالعہ (بحوالہ خصوصی ہندو مسلم افسانہ نگاروں کے حوالے سے)

نگران استاد------ڈاکٹر حمیرا اشفاق-----------مکمل کیا ہے۔

مسماۃ---رفعت بانو------ولدیت غلام محی الدین لون-اس بات کا حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ ہذا ہر قسم کے سرقہ سے پاک ہے۔ مسماۃ نے مقالہ ہذا کو کسی اور ڈگری کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ پیش کرونگی۔ ان تما حقائق کا اقرار کرتی ہوں کے میں نے کوئی امر مخفی نہیں رکھا۔ لہذا غلط بیانی کیصورت میں ہر قسم کی ذمہ داری مسمات پر عائد ہوگی۔

العبد

--رفعت بانو---ولدیت-غلام محی الدین لون

رجسٹریشن نمبر--234-FLL/MSUrdu/F17

شناختی کارڈ/پاسپورٹ نمبر--NoS09431

شعبہ-----اردو (خواتین)--------

ATTESTED
ASAD ABBAS JAFRI
NOTARY PUBLIC

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Rifat Bano**

Title of the Thesis: جموں وکشمیر کے منتخب افسانہ نگاروں کا فکری مطالعہ (بحوالہ خصوصی ہندو مسلم افسانہ نگاروں کے حوالے سے)

Registration No: **234-FLL/MSURD/F17**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Robina Shahnaz
Professor
NUML , Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Ghulam Faida
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

اقرار نامہ

میں، رفعت بانو حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے ایم-ایس سکالر (اُردو) کی حیثیت سے صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونی ورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ پیش کروں گی اور میرا یہ مقالہ سرقہ سے پاک ہے۔

رفعت بانو

مقالہ نگار

فہرست ابواب

اقرار نامہ		ii
تصدیق نامہ		iii
پیش لفظ		v
باب اول:	ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کی روایت	۱
باب دوم:	مسلم افسانہ نگاروں کے افسانوں میں ریاست جموں و کشمیر کے حوالے سے فکری و نظری مباحث کا مطالعہ	۲۰
باب سوم:	غیر مسلم افسانہ نگاروں کے افسانوں میں ریاست جموں و کشمیر کے حوالے سے فکری و نظری مباحث کا مطالعہ	۴۸
باب چہارم:	ہندو اور مسلم فکر کے تناظر میں ریاست جموں و کشمیر کی صورت حال کا جائزہ	۷۱
ماحصل		۸۵
کتابیات		۹۰

پیش لفظ

نثری ادب میں افسانے کی صنف کافی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ صنف اردو میں مغرب کی وساطت سے داخل ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس صنف نے بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی۔ اس صنف کو وسیع تر کرنے کے لئے جن افسانہ نگاروں نے اپنی فنی بصیرتوں سے لوہا منوا کر اس صنف میں چار چاند لگائیں۔ ان میں پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسین منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور راجندر سنگھ بیدی کے نام خصوصت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانے کی روایت کے پس منظر کی بات ہے تو اس صنف افسانہ میں وادی کے حساس قلم کاروں نے بھی بیرون ریاست کے فکشن نگاروں کی طرح صنف افسانہ میں اپنے قلم سے ایسے جوہر دکھائے جو ناقابل فراموش ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے جہاں جنتِ نظیر کے ٹھنڈے میٹھے چشموں، جھرنوں، سرسبز و شاداب سیراؤں، بلند کہساروں اور دریاؤں کے نغموں کی منظر کشی کر کے کشمیر کے حسن کو بیان کیا ہے تو وہیں کشمیر کے دوسرے مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان افسانوں نگاروں میں محمد دین فوق، پرین ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، مالک رام آنند، حامدی کاشمیری، موہن یاور، پشکر ناتھ اور جان محمد آزاد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے جہاں رومانوی طنزیہ اور اصلاحی افسانے تخلیق کر کے اچھے خاصے حلقے کو بے حد متاثر کیا تو وہیں انھوں نے اپنی کہانیوں میں ریاست کے مسائل، بے روزگاری، ظلم و ستم، مفلسی اور بربریت کو بھی اپنی تحریروں میں جگہ دی۔

ریاست جموں و کشمیر سے ابھی مسائل کے ڈیرے اٹھے نہیں تھے کہ برصغیر کی تقسیم کا سلسلہ عمل میں آیا۔ جس کے گہرے اثرات جنتِ نظیر پر بھی پڑے اس کے سینے پر بھی خونی لکیر عمل میں آگئی تھی۔ اس خونی لکیر نے خوشحال کشمیر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ جس کے اثرات وادی کے ہر اس حساس تخلیق کار پر پڑے جس نے ان مسائل کو اپنی صلاحیتوں سے صفحے قرطاس پر اتارا۔ البتہ ۱۹۹۰ء کے بعد کی افسانہ نگاری پر طاہرانہ نظر ڈالی جائے تو اس میں زیادہ ہمیں وادی کے ان واقعات کا ذکر ملتا ہے جن میں انکاونٹر، کریک ڈاون، عورتوں کی عصمت دری، گم نام قبرستان اور

ہجرت جیسے مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے۔اس طرح یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ ۱۹۹۰ء کے بعد کشمیر کا افسانہ کشمیر کی سب سے زیادہ اس صورت حال کی عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے جس میں جلتے ہوئے کشمیر کی تصویر ہے۔ان سب واقعات کو وادی کے ان نیک قلم کاروں میں حساس اذہان کے مالک نور شاہ، شبنم قیوم،ورندر پٹواری ،دیپک بدکی،دیپک کنول، عمر مجید، خالد حسین اور ریاض توحیدی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے نڈر ہو کر اپنے قلم سے وادی کے اصل حقائق کو اپنی کہانیوں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں شعبہ اردو کی ریسرچ کمیٹی کی بے حد مشکور ہوں۔ جنہوں نے مجھے ریاست جموں وکشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں پر کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ریاست جموں وکشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں کو اس سے قبل تحقیقی و تنقیدی موضوع بنایا گیا ہے اور افسانہ نگاری کے حوالے بھی کافی حد تک کام ہو چکا ہے تاہم ریاست جموں وکشمیر کے معاصر منتخب ہندو اور مسلم افسانہ نگاروں کے حوالے سے کام نہیں ہوا ہے اس بات کو مدِ نظر رکھ کر راقم الحروف نے ان معاصر ہندو اور مسلم افسانہ نگاروں کے نظریات کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا۔اس تحقیقی مقالے کو مکمل کرتے ہوئے حتی المقدور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مقالے سے متعلق کوئی بات چھوٹنے نہ پائے۔پھر بھی کہا گیا ہے کہ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی، ہو سکتا ہے کہ مجھ سے بھی کوتاہیاں ہوئی ہوں۔

میرے تحقیقی مقالے کا عنوان "ریاست جموں وکشمیر کے منتخب معاصر افسانہ نگاروں کا فکری مطالعہ (بحوالہ خصوصی ہندو اور مسلم افسانہ نگار)" ہے۔

پہلا باب: "جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی روایت" پر مبنی ہے۔اس باب میں ابتداء سے دور حاضر تک ریاست میں جتنے بھی افسانہ نگار ہوئے ہیں ان کی تصنیفات کا جائزہ لیتے ہوئے جموں وکشمیر میں اردو افسانے کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

دوسرا باب: "مسلم افسانہ نگاروں کے افسانوں میں ریاست جموں وکشمیر کے حوالے سے فکری و نظری مباحث کا مطالعہ" کے عنوان سے ہے۔اس باب میں مسلم افسانہ نگار نور شاہ، شبنم قیوم اور ریاض توحیدی کے منتخب افسانوں کا فکری و نظری جائزہ لیا گیا اور مسلم افسانہ نگاروں کی سوچ اور فکر کے تناظر میں ریاست جموں وکشمیر کی صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تیسرا باب: "غیر مسلم افسانہ نگارروں کے افسانوں میں ریاست جموں وکشمیر کے حوالے سے فکری و نظریاتی مباحث کا مطالعہ" کے نام سے ہے۔اس باب میں غیر مسلم افسانہ نگاروں کی روشنی میں کشمیر کے خاکے کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھا باب: "ہندو اور مسلم فکر کے تناظر میں ریاست جموں وکشمیر کی صورت حال کا جائزہ" کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ہندو اور مسلم افسانہ نگاروں کے فکری رویوں کا تقابلی جائزہ لے کر راقم الحروف نے سچ اور جھوٹ کی اصلی حقیقت باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تحقیقی مقالے کے آخر میں حاصلات، نتائج اور سفارشات کو مبسوط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اپنے اس تحقیقی مقالے کو اختتام تک پہچانے کے لئے مجھے بہت دشوار راستوں سے گزرنا پڑا مگر خداوند قدوس کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ جس نے مجھ ناچیز کو نہ صرف صحت و تندرستی عطا کی بلکہ میرے راستے میں حائل ہونے والی تمام دشواریوں اور مشکلات کو آسان کر دیا۔

ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی نگرانی میں یہ تحقیقی مقالہ مکمل کرنے میں خود کو خوش بخت محسوس کرتی ہوں۔کیوں کہ ان کی نگرانی میں کام کرنا اور ان کے علمی فیوض و برکات سے اپنے علم میں وسعت نصیب ہوئی۔پروفیسر موصوف کی شفقت، تربیت، رہنمائی اور تعاون کے لئے سراپا مشکور و ممنون ہوں۔ان کی پُر وقار شخصیت نے مجھے

جس قدر متاثر کیااور میرا حوصلہ بڑھایااس مقام پر مجھے مجروح سلطان پوری کا یہ شعر یاد آتا ہے جو ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی شخصیت پر صادق نظر آتا ہے:

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے

تیرا ہاتھ، ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ کے جل گئے

(مجروح)

میں اپنے والدین کی بے حد احسان مند ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرنا اپنا اولیّن فرض سمجھتی ہوں کیوں کہ ان کی نیک دعائیں ہمیشہ شاملِ حال ہیں۔ میں آج کچھ بھی ہوں انہیں کی شفقتوں اور نیک دعاؤں کے طفیل ہوں۔ جن کی تربیت سے میری شخصیت مین نکھار آیا، میں اپنے والدین کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ان کی شفقت کا سایہ اور دعائیں ہر لمحہ میرے ساتھ رکھے، آمین!

دیگر افراد خانہ میں اپنے بھائی معروف احمد لون کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے میری تعلیم حاصل کرانے میں بہت دلچسپی لی۔ ساتھ ہی اپنی بہنوں توقیرہ اور صبا کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر وقت میری رہنمائی اور ہمت افزائی کی، اپنی چھوٹی بہن نعیمہ جان کی بھی مشکور ہوں جنھون نے اپنی سنی کے باوجود بھی مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اور ہر مشکل میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

میں انتہائی ممنون ہوں ڈاکٹر محمد خان صاحب کی(Department of social science)جنھوں نے مجھے اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا اور ہر وقت میں میری رہنمائی کی۔

میں ان تخلیق کاروں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو میرے اس تحقیقی ہذا میں شامل ہیں۔ جن میں نور شاہ، شبنم قیوم، ریاض توحیدی، ورندر پٹواری، دیپک بدکی اور دیپک کنول شامل ہیں جب بھی میں نے ان سے ملاقات یا ٹیلی

فون پر بات کی تو انھوں نے خندہ پیشانی سے میرے سوالوں کا تسلّی بخش جواب دیا اور میری ہمت بڑھائی۔ بالخصوص ڈاکٹر ریاض توحیدی صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔

میں ڈاکٹر محمد وقار صدیقی (شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی بے حد ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے پہلے دن سے مقالے کی تکمیل تک ہر ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ بے انتہا مصروفیات کے باوجود ٹیلی فون یا انٹرنیٹ کے ذریعے مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔

آخر میں اپنے دوستوں خاص طور پر ماریہ امجد کا بھی شکریہ ادا کرنا لازمی سمجھتی ہوں جنھوں نے اپنے قیمتی وقت میں بہت سے لمحات میرے نام کئے اور مقالے کی تکمیل میں میرا بھرپور ساتھ دیا اور میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

رفعت بانو

ایم۔ایس (اُردو)

باب اوّل :

ریاست جموں کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کی روایت

کہانی کہنا اور سننا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ابتداء سے ہی کہانی سننے کی طرف انسان کا رجحان رہا ہے۔ کہانی اس کی دلچسپی اور فارغ وقت کا ایک بہترین زریعہ تھا، جس نے آہستہ آہستہ باقاعدہ ایک فن کی صورت اختیار کر لی۔ قدیم زمانے میں داستان گو کا بہت رُتبہ ہوا کرتا تھا لوگ فارغ وقت میں داستان گو کے آس پاس جمع ہو جایا کرتے تھے اور کہانی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ داستان گو کی قدیم دور میں درباروں سے بھی وابستی ہوا کرتی تھی، بادشاہ ان سے ذہنی و قلبی تسکین اور روحانی تسلی کے لیے داستانیں سنا کرتے تھے۔ قدیم زمانے میں ادب کو صرف دل بہلانے اور وقت گزارنے کی چیز سمجھا جاتا تھا لیکن آج کے زمانے میں ادب زندگی کی نمائندگی کرتا ہے یعنی انسانی زندگی کے مسائل اس کا لازمی جزو بن گے ہیں۔ ادب برائے ادب کے زمرے سے نکل کر ادب برائے زندگی کے مرحلے سے جڑ گیا۔ اس کے پس منظر میں مختلف اسباب کار فرما رہیں۔ سائنس کی ترقی سے نئے حالات پیدا ہوئے زندگی کی مختلف شعبہ جات میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں ،حیات و کائنات کے ساتھ ساتھ جب لوگوں کی مالی حالت میں بہتری اور سماج میں تبدیلیاں ہوئیں اور انسان زیادہ تر روزمرہ کے کاموں میں مصروف رہنے لگا۔ طویل داستانیں سُننے اور سنانے کا وقت بھی لوگوں کے پاس نہیں رہا پھر ایسا زمانہ آیا جب طوالت اور حیران کن واقعات کو چھوڑ کر حقیقی زندگی کی ترجمانی ہونے لگی یوں ناول کا جنم ہوا۔ چونکہ ناول کا کینواس بہت وسیع ہوتا ہے اس لیے تخلیق کار اور قاری دونوں سے اس کے شدید تقاضے رہے۔ لہذا جدید میشنی اور صنعتی دور میں تھکا دینے والی مصروف اور تیز ترین زندگی میں انسان کے پاس طویل و ضخیم داستانوں اور ناولوں کا مطالعہ کرنے کا وقت نہیں تھا جس سے ایک مختصر کہانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس کو افسانہ کی صورت میں پورا کیا گیا۔ مختصر افسانے میں پوری زندگی کو پیش نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ اس میں زندگی کے کسی ایک رُخ اور کردار کے کسی ایک پہلو کو بیان کیا جاسکتا ہے۔ جاوید اقبال شاہ اپنی کتاب میں یوں بیان کرتے ہیں:

> دنیا کی ہر شے کی طرح ادب بھی حالات اور زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ زمانے کے کروٹوں کے ساتھ فکشن نے بھی کئی روپ بدلے۔ داستان، ناول اور افسانہ ۔۔۔۔ ان تینوں میں جو خصوصیات مشترکہ ہیں وہ قصّہ کی پیش کا انداز ہے۔[1]

بیسوی صدی کا سورج طلوع ہوتے ہی یورپی اثرات کے تحت بر صغیر میں اُردو افسانے نے جنم لیا اور برق رفتاری سے ارتقائی منازل طے کر لی ہیں۔ بیسوی صدی سے پہلے بر صغیر میں مختصر افسانہ مغرب کی پیداوار ہے وہاں پر نشو و نما ہونے کے بعد ہی ہندوستان میں بیسوی صدی کے اوئل میں ہی پھلنا پھولنا شروع ہو گیا تھا اور اُس نے اردو ادب میں پہلا قدم ہی پوری طاقت کے ساتھ رکھا جس میں، راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند جیسے مقبول افسانہ نگار ہمارے سامنے آئے ہیں۔

اس طرح جب ہم ریاست جموں و کشمیر میں افسانے کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں اُردو افسانہ نگاری کی ایک روشن روایت رہی ہے بر صغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں خاص کر لکھنو اور دہلی میں اردو کا تاریخی مراکز کو اہمیت کم ہونے کے بعد ریاست جموں و کشمیر ہی واحد ریاست ہے جہاں آئینی طور پر حکومت نے اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت عطا کی۔ اور ۱۸۸۹ء میں مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان کے منصب پر فائز کر دیا۔[۲] اسی دور میں اُردو زبان کا چلن عام ہوا اور ساتھ ہی شعر و شاعری کی محفلوں کا بھی آغاز ہوا۔ ابتداء میں اگرچہ ان ادیبوں کا رجحان زیادہ تر شاعری کی طرف رہا لیکن شاعری کے بعد اگر کسی صنف کو مقبولیت حاصل ہوئی تو وہ افسانہ ہے۔ عبدالقادر سروری یوں لکھتے ہیں:

> شاعری کے بعد جموں و کشمیر کے ادیبوں کی صلاحتیں کسی صنف میں نمایاں ہوتی ہیں تو وہ افسانہ نویسی ہے۔[۳]

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو افسانے کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس سلسلے میں محققین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اس لیے وہاں مختلف نظریات ملتے ہیں۔ بعض کے مطابق محمد دین فوق اور چراغ حسن حسرت کو ریاست جموں و کشمیر کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں جبکہ بعض پریم ناتھ پردیسی کو ریاست جموں و کشمیر کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر برج پریمی:

> ریاست میں اُردو افسانے کی طرف سب سے پہلے مورخ، ادیب، شاعر اور صحافی محمد دین فوق نے توجہ دلائی۔۔۔۔ فوق نے روشن زمانے کے مطابق کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصّے قلمبند کیے جنہیں ہم ریاست میں اردو افسانے کے اولین نقوش کہہ سکتے ہیں۔[۴]

ریاست جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں کے اولیت پر بات کرتے ہوئے جہاں ڈاکٹر جہاں برج پریمی نے محمد الدین فوق کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے وہیں دوسری جانب پروفیسر عبدالقادر سروری اور نور شاہ پریم ناتھ پردیسی کو ریاست جموں و کشمیر کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہوئے نور شاہ لکھتے ہیں:

> ریاست میں اُردو افسانے کی ابتداء پردیسی سے ہی ہوئی۔۔۔۔پردیسی کے افسانوں کی اہمیت، افادیت اور انفرادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانے تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم کے بعد بھی مشہور و معروف اور معیاری جرائید میں شائع ہوتے رہے۔۵

پروفیسر عبدالقادر سروری "کشمیر میں اُردو" کی تیسری جلد میں پریم ناتھ پردیسی کو ریاست کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

> نئے شعور کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی ریاست کے افسانہ نگاروں نے اپنے عصری مسائل کو افسانے کے ذریعے اُبھارنے کی کوشش کی۔اس کے ابتدائی آثار پریم پردیسی کے یہاں نظر آتے ہیں۔٦

پریم ناتھ پردیسی نے جب لکھنا شروع کیا تھا تو ابتداء میں اگرچہ رومانیت کی طرف توجہ دی لیکن پریم چند کے افسانے "انگارے" کی اشاعت اور پھر ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر حقیقت نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔پریم ناتھ پردیسی کی تین افسانوی مجموعے "شام و سحر"، "دنیا ہماری" اور "بہتے چراغ" شائع ہو چکے ہیں۔لیکن سب سے زیادہ شہرت ان کے افسانوی مجموعہ "بہتے چراغ" کو حاصل ہوئی ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح برصغیر کی سطح پر اُردو میں مختصر افسانے کے بنیاد گزاروں میں تین شخصیات، راشد الخیری، پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے نام آتے ہیں اسی طرح جموں و کشمیر میں بھی افسانہ نگاری کی شروعات میں محمد دین فوق، چراغ حسن حسرت اور پریم ناتھ پردیسی کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔پنڈت پریم ناتھ پردیسی کو ریاست جموں و کشمیر کا پہلا افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔پریم ناتھ پردیسی کے افسانے فن کے کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔انھوں نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب ریاست جموں و کشمیر میں شخصی راج تھا۔پریم ناتھ پردیسی نے اپنے افسانوں میں ڈوگرہ شاہی کے ظلم و ستم، غلامی، سیاسی و سماجی، طبقاتی کشمکش، بھوک، بے راہ روی کو موضوع بنایا ہے۔چونکہ ریاست جموں و کشمیر میں برصغیر کی آزادی سے قبل کا زمانہ شخصی راج کا زمانہ تھا اس لیے ان کے افسانوں میں دُکھ درد، افلاس، غلامی، پریشانی جیسے ہوش رُبا موضوعات چنے اور حقیقت پسندانہ رجحان اپنانے پر مجبور ہوئے۔ڈاکٹر قدوس جاوید اپنے مضمون میں پریم ناتھ پردیسی کی تحریر کو یوں نقل کرتے ہیں:

> کشمیر کا ہر بد نصیب باشندہ خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی باہر کے چند نامور افسانہ نگاروں نے کچھ کہانیاں ضرور لکھیں مگر وہ بھی غلط انداز میں۔۔۔۔ یہاں پر سب سے بڑا مسئلہ غلامی ہے ،افلاس ہے۔[۷]

پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی عکاسی صحیح معنوں میں کی ہے۔اور انھوں نے کشمیر کے حسین مناظر، وہاں کی زندگی ،انسانوں کی ذہانت ، تہذیب و تمدن اور معاشرے کو اصلی روپ میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔بقول پروفیسر حامدی کشمیری:

> پردیسی کی نظر اردو افسانوی ادب اور اس کی اسالیب و موضوعات پر تھی۔انھوں نے اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کی اور اہل کشمیر کے گھریلوں، سماجی۔سیاسی اور نفسیاتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔[۸]

اس عہد کے ایک اور اہم افسانہ نگار پریم ناتھ در (وفات: ۱۹۷۷ء) ہیں۔[۹] وہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں اُردو افسانے کی دنیا میں نمودار ہوئے۔ابتدائی تعلیم سرینگر میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور چلے گئے۔جہاں وہ ترقی پسندی سے متاثر ہوئے۔در کی زندگی کا بیشتر حصّہ وادی کشمیر سے باہر گزرا لیکن وہ کسی حال میں بھی وادی کشمیر کو نہیں بھولے۔دراصل وہ بھی کشمیر کی تحریک آزادی کے ایک رُکن تھے۔ریاست جموں و کشمیر میں اُس وقت شیخ محمد عبداللہ شخصی حکومت کے خلاف عام لوگوں کی قیادت کر رہے تھے۔در بھی اس جدوجہد میں کود پڑے اس طرح در اُس زمانے میں ایک طرف سیاست میں عملی طور پر حصّہ لے رہے تھے تو دوسری طرف اپنے افسانوں کے ذریعے عوام کو جہالت، غیر یقینی ،غلامی، طبقاتی کشمکش وغیرہ سے بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

پریم ناتھ در کا پہلا افسانوی مجموعہ "کاغذ کا واسدیو" ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا اور ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "نیلی آنکھیں" ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آیا۔[۱۰] انہوں نے اپنے افسانوں میں ریاست جموں و کشمیر کی سماجی زندگی کی اچھی طرح مرقوکشی کی ہے۔ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب "جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما" میں یوں بیان کرتے ہیں:

> پریم ناتھ در کے ہاں غضب کا باریک مشاہدہ نظر آتا ہے وہ اس بے چارگی اور لاچارگی کی تہوں تک ٹٹول کر نیچے جاتے ہیں اور ان حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں۔جس نے یہاں کے عوام کو افلاس اور بھوک کی اندھی غاروں میں دھکیل دیا تھا۔در کے موضوعات ہماری آس پاس کی زندگی اور اس سڑے ہوئے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔[۱۱]

پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در کے بعد افسانہ نگاری کے میدان میں کشمیری لال ذاکر کا نام آتا ہیں۔ وہ ترقی پسند رجحانات سے بے حد متاثر تھے اس لیے انہوں نے ریاست جموں و کشمیر کی آزادی کے حوالے سے سب سے زیادہ افسانے لکھیں ہیں۔ جب وہ کشمیر سے باہر تھے تو اُس وقت بھی کشمیر کے بارے میں لکھتے رہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع انسانی زندگی، معاشی، اقتصادی پہلو، غربت، مفلسی، ظالم و مظلوم، سیاسی و سماجی اور جنس و نفسیات ہے ان موضوعات کو انہوں نے بڑے حسین مرقعے سے پیش کیا ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "جب کشمیر جل رہا تھا" (۱۹۴۸ء) اس کے بعد "توی اور جہلم "۱۹۶۵ء" اداس شام کے آخری لمحے "۱۹۸۹ء اور "پریوں والا فقیر "۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ ۱۲ ان کے یہ تمام افسانوی مجموعے افسانوی ادب میں ایک اہم حشیت رکھتے ہیں اس طرح انہوں نے اُردو افسانوی دنیا میں اپنا مقام بنالیا ہے۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں کئی ایسے نام بھی ہیں جن کے افسانوی مجموعے اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ جس میں قدرت اللہ شہاب، رامانند ساگر، جگدیش کنول، ٹھاکر پونچھی، سومناتھ زشتی، موہن یاور، محمود ہاشمی، کندن لال کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قدرت اللہ شہاب کا "سردار جسونت سنگھ "، "رامانند ساگر کا "ٹنگ مرگ کے اڑے پر "، "آئینے اور آب حیات، "موہن یاور کے "اُڑتے آنچل "، "سیاہ تاج محل "، "تیسری آنکھ "، "وسکی کی بوتل "اور ٹاکر پونچھی کے "خانہ بدوش "، "بے خواب کواڑ" وغیرہ یادگار افسانوی مجموعے ہیں ان افسانوں میں ریاستی راج، جاگردانہ نظام ،سیاسی و سماجی، دہاتی ماحول، اقتصادی بدحالی اور سماجی و طبقاتی کشمکش کے نمونے ملتے ہیں۔ ریاست میں ابھی ان افسانہ نگاروں کا اپنی منزل کی طرف سفر جاری ہی تھا کہ تقسیم ملک کا سانحہ در پیش آیا۔ تقسیم کے بعد ہر طرف افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا ،سیاسی و سماجی سطح پر بہت سی تبدلیاں رونما ہوئیں اور لکھنے والوں کا کارواں سامنے آگیا تھا وہ بھی دیکھتے دیکھتے بکھر گیا سرحد کے دونوں جانب ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا اسی اثنا میں ریاست جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کی ایک بڑی جماعت ریاست جموں و کشمیر چھوڑ کر پاکستان چلیں گیں۔ پاکستان جانے والے ادیبوں اور شاعروں میں قدرت اللہ شہاب ، کوشر سیمابی، شیخ منظور الہیٰ، کیف اسرائیلی، محمد عمر نور الہیٰ، عبد العزیز علائی، طالب گورکانی، محبوبہ یاسمین اور عزیز پرکاش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ افسانہ نگار ہجرت تو کر گئے مگر ان کی کشمیر سے وابستگی بدستور جاری رہی۔ ریاست میں جو افسانہ نگار کشمیر میں رہ گئے ان میں کشمیری لال ذاکر، دیا کریشن گردش، جگدیش کنول، ٹھاکر پونچھی، کندن لعل، کنول نین پرواز وغیرہ ملک کے دیگر حصّوں میں جاکر رہائش پذیر ہو گئے۔

موہن یاور ریاست جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے آزادی سے پہلے ہی افسانے لکھنے شروع کیے تھے۔ موہن یاور نے تقسیم سے قبل لکھنا شروع کیا۔ وہ اپنے افسانوں کے لیے موضوعات روز مرہ

کی زندگی سے اخذ کرتے ہیں۔ان کے تین افسانوں مجموعے شائع ہو چکے ہیں "وہسکی کی بوتل"، "سیاہ تاج محل" اور "تیسری آنکھ"۔بقول جاوید اقبال شاہ:

> موہن یاور واقعات کو فن اور تکنیک کے قلب میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ وہ جیتی جاگتی دُنیا کے کردار واقعات بن جاتے ہیں۔ ۱۳

ٹھاکر پونچھی ریاست جموں وکشمیر کے اہم افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے بھی تقسیم کے بعد لکھنا شروع کیا تھا۔اگرچہ ناول نگاری ان کا خاص میدان رہا لیکن افسانہ نگاری میں وہ اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں وہ پونچھ میں جاگردانہ عہدے سے وابستہ رہے اور ایک مدت کی شاہی دربار سے منسلک رہے۔انہوں نے اس وقت جاگرداری اور سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے مظالم، غریبی، بھوک، بے روزگاری کا بڑے قریب سے دیکھا اور عوامی مسائل پر بھرپور لکھنے لگے وہ اپنے افسانوں کے ذریعے عوام کو جہالت، غریبی اور بھوک کی اندھی غاروں سے نکال کر ان میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ان کے افسانوی مجموعے "خانہ بدوش"، "یہ پھتر میرے ہیں" "بے خواب کواڑ کو منظر عام پر لا کر ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کی بے لوث خدمت انجام دی۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی زندگی کا آغاز افسانوں سے کیا۔آزادی اور تقسیم کے حوالے سے ان کا افسانہ "یاخدا" اہم ہے ۔تقسیم کے بعد قدرت اللہ شہاب پاکستان چلے گیے اور وہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔برصغیر کے تقسیم سے پہلے ریاست جموں وکشمیر میں رہتے ہوئے بے شمار ایسے افسانے لکھے جن میں کشمیریوں کی کسمپرسی اور مظلومیت کی داستان نظر آتی ہے اس ضمن میں ان کے افسانے "سر درد"، "حشونت سنگھ" اور "دور نگا" بے حد اہم ہیں۔

ریاست میں اُردو افسانے کے ارتقائی دور میں سوم ناتھ زشتی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔یوں تو انہوں نے ۱۹۳۰ء سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۴ لیکن ان کی فکر و سوچ کی صحیح رہنمائی ترقی پسندی تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد ہوئی۔زشتی نے اصلاحی اور مقصدی افسانے لکھ کر اپنی الگ پہچان بنائی۔زشتی کا پہلا افسانہ "ساردا" ۱۹۳۸ء میں مارتنڈ میں چھپا۔ ۱۵ ان کے افسانوں میں روزمرہ زندگی کے علاوہ ذہنی الجھاؤ اور انسانی نفسیات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔اس کے علاوہ وہ کلچرل فرنٹ سے بھی وابستہ رہے۔عبدالقادر سروری ان کے افسانوں سے متاثر ہو کر یوں رقمطراز ہیں:

> اُن کی کہانیوں کا سماجی پس منظر کشمیری ہے ان میں کشمیری پنڈت ہیں۔ہانجی ہیں، ہاوس بوٹ ہیں۔ ۱۶

تقسیم کے بعد جہاں ایک طرف سماجی اور سیاسی حالات میں تبدیلیاں رونما ہوئیں وہی ادبی زندگی نے بھی کروٹ لی۔افسانہ نگاروں کی اس نسل کے ساتھ ہی ساتھ ریاست میں ایک اور گروہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ نئی نسل کے ان افسانہ نگاروں میں حامدی کاشمری، برج پریمی، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، پیکر ناتھ، اختر محی الدین، شبنم قیوم، وید راہی، مالک رام آنند، نور شاہ، جگدیش بھارتی، غلام رسول سنتوش اور دیپک کنول وغیرہ کا نام اہمیت کے حامل ہیں۔ان افسانہ نگاروں نے زیادہ تر سیاسی حالات اور سماجی بد عنوانیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ان افسانہ نگاروں کے ہاں موضوع اور نئے تجربے ملتے ہیں انہوں نے نہ صرف پرانی روایات کو برقرار رکھا بلکہ زمانے کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات، ہیت اور تکنیک کے نئے تجربات کو اپنے فن میں سمو کر افسانے کی روایت کو آگے بڑھایا۔ چنانچہ ان افسانہ نگاروں کے ہاں خالی رومان ہی نہیں بلکہ حقیقت نگاری کی تلخیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے۔وہ اُردو افسانے کے لیے موضوعات کی ایک قوس وقزح کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس میں بہت سے پرانے اور نیے رُنگ یکجا ہو گئے ادب کے بارے میں نظریات بدلنے لگے ترقی پسندی کا زوال اور جدیدیت کا عروج ہوا۔ کئی لکھنے والے ترقی پسندی کے قائل تھے وہ جدیدیت سے متاثر ہوئے۔انہوں نے ریاستی اور ملکی حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حالات و واقعات پر بھی توجہ دی۔ جدید افسانہ میں حقیقت نگاری، تقسیم ملک کا المیہ، خون ریزی، خوف، ہجرت اور جلاوطنی، تنہائی کا احساس، محرومی ومایوسی، بچھڑے ہوئے انسان کی تلاش وغیرہ جیسے موضوعات کے مختلف پہلوں کا احاطہ کیا گیا۔ان بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر افسانے نے علامتی اور تجریدی روپ بھی اختیار کر لیا۔

نئے افسانہ نگاروں کی صف میں حامد کاشمیری ہیں۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن افسانے کی صنف پر بھی انہوں نے قلم اُٹھایا ہے اور اچھے افسانے تخلیق کیے ہیں شروع میں ترقی پسند تحریک کا ان پر بھی اثر رہا ہیں اور وہ سماجی مسائل کی طرف توجہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ابتداء میں اگرچہ وہ سماجی مسائل میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے افسانوں کے موضوعات بدل دیتے ہیں اور شخصی تجربات کا گہرا شعور حاصل کرنے کے بعد وہ جدیدیت کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ان کے افسانے مجموعے "وادی کے پھول"، "برف میں آگ"، "آگ ہے اور دھوپ نہیں" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں کشمیری تہذیب، کلچر اور لوگوں کی نفسیاتی اُلجھنوں کو دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔بقول نور شاہ:

ان کی کہانیوں میں کشمیر کا ماحول، سماجی اور سیاسی حالات اور کشمیر کے لوگوں کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔۱۸؎

ریاست جموں و کشمیر کے اور افسانہ نگار پشکر ناتھ ہیں ان کے تین افسانے مجموعے "اندھیرے اُجالے "ڈل کے باسی "اور "عشق کا چاند اندھیرا" شائع ہو چکے ہیں لیکن ابتداء میں اُن کے افسانوں پر رومانیت غالب رہی اور ارتقائی مراحل طے کر کے حقیقت نگاری کی طرف گامزن ہوئے اور وقت کے تغیرات کے ساتھ ساتھ روایتی انداز سے ہٹ کر زندگی کے تلخ حقائق بے معنویت اور اقدار کی شکست کے افسانوں کو موضوع بناتے رہے۔انہوں نے اپنے وسیع مشاہدے اور گہرے مطالعے کی بنا پر نئے نئے پیکر تراشنے کی کوشش کی وہ اپنے افسانوں کے لیے مواد روزمرہ زندگی سے اخذ کرتے ہیں جس کی وجہ اُن کے افسانوں میں زبان و بیان کی دل کشی اور روزمرہ کا لطف ملتا ہے۔بقول برج پریمی:

> پشکر ناتھ کی کہانیوں میں جذبے اور احساس کا ادراک ملتا ہے اور منجھا ہوا شعور بھی ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے جس کی مدد سے انہوں نے خوب سے خوب تر لکھا ہے۔۱۹؎

نور شاہ کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے نمائندہ فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے ناول بھی لکھے ،ریڈیو ڈرامے، خاکے بھی لکھے لیکن افسانہ نگاری سے انہیں خاصی شہرت حاصل ہوئی۔نور شاہ نے ریاست میں افسانے کے ارتقاء میں پہلی نسل کے افسانہ نگاروں کا ساتھ دیا ہی ہے۔لیکن دوسری نسل کے افسانہ نگاروں کی بھی رہنمائی کی ہے۔اس اعتبار سے نور شاہ ایک ایسے افسانہ نگار ہے جنہوں نے بیک وقت کئی نسلوں کا ساتھ دیا ہے اور آج بھی بے تکان ساتھ نبھا رہے ہیں۔نور شاہ بنیادی طور پر شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں بھی شاعرانہ اسلوب نظر آتا ہے۔نور شاہ ایک ایسے فنکار ہیں جن کا دل گرد و پیش میں ہونے والے ظلم و جبر ،مار دھاڑ، لوٹ کھسوٹ اور استحصال کو دیکھ کر رو پڑتا ہے ۔انہوں نے سینکڑوں کردار تخلیق کیے ہیں۔ہر کردار کشمیری سماج کے اونچے یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔کشمیری عوام کی زندگی اُن کے رنج و غم ،ان کی تمناؤں ،ان کے جذبات اور خواہشات کے کتنے مرقعے اُن کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ابتداء میں ان کے افسانوں پر رومانیت غالب رہی اور ارتقائی مراحل طے کر کے حقیقت نگاری کی طرف گامزن ہوئے۔انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور فن کارانہ ہنر مندی سے اس کی عکاسی کی ہے۔ان کے سات افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "بے گھاٹ کی ناؤ"، "ویرانے کے پھول"، "من کا آنگن اُداس اُداس"، "گیلے پتھروں کی مہک"، "بے ثمر سچ"، "آسمان پھول" اور "لہو اور کشمیر کہانی" خصوصیت کے حامل ہیں۔اس کے علاوہ ان کے چار ناول بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔

ان افسانہ نگاروں کے علاوہ علی محمد لون، اختر محی الدین اور غلام رسول سنتوش نے بھی اہم رول ادا کیا۔ انہوں نے ادبی زندگی کا آغاز اُردو سے کیا۔ لیکن بعد ازیں کشمیری زُبان میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا علی محمد لون بنیادی طور پر ڈرامہ نگار تھے لیکن ڈراموں کے ساتھ ساتھ انہوں نے افسانے بھی لکھے۔ ان کی تحریر کردہ کہانیاں "مونچھوں والی گڑیا"، "آرزو کا سلسلہ لاانتہا"، "مہمان اور نامے" اُردو کے بہترین کہانیوں میں شمار ہوتی ہیں۔

اختر محی الدین جموں و کشمیر کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنہیں ۱۹۵۴ء میں ان کے اُردو افسانے "پونڈرچ" کو بین الاقوامی مقابلے میں دوسرے انعام سے نوازا گیا۔ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۵ء کے دوران انہوں نے اُردو افسانے لکھے جن میں "بھاؤ گر رہے ہیں"، "رات مرگی"، "پیوند" اور "گدھ" قابل ذکر ہیں۔ ۲۰

غلام رسول سنتوش بنیادی طور پر پینٹر تھے۔ ان کے افسانوں میں ایک پینٹر کا دل دھڑکتا ہے ان کے افسانے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں قرابت دوریاں"، ٹھنڈی آگ کا دھواں" اور "چار چناری" خصوصیت کے حامل ہیں۔

مندرجہ بالا افسانہ نگاروں کے علاوہ ان کے معاصرین میں کئی اور نام بھی گنائے جا سکتے ہیں جن کی کوششوں سے ریاست جموں و کشمیر میں افسانہ نگاری کی مستحکم روایت قائم ہوئی ان افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے ریاست کے عوام کو درپیش مسائل کا احاطہ کیا اور ریاست میں اُردو افسانے کی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں نئے نئے تجربے بھی کیے۔ جن میں عمر مجید، کلدیپ رعنا، موہن سرما، برج پریمی، ہری کرشن کول، مدن موہن سرما کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

بہر حال ۱۹۹۰ء کے بعد اس صورت حال میں بہت سی تبدیلی آئی۔ ۲۱ ریاست خاص کر وادی کشمیر دہشت گردی اور ظلم و تشدد کا شکار ہو گئی۔ جہاں گھر کاروبار، جانوں عصمتوں پر حملے ہوئے ہر طرف مایوسی اور افراتفری پھیل گئی۔ یوں جنت نما کشمیر دوزخ میں تبدیل ہو گئی۔ لوگ نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو گئے۔ وادی کے ان ناسازگار حالات نے رومان پسند اور جدیدیت پسند افسانہ نگاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور انہوں نے حقیقت نگاری کا دامن پکڑ لیا۔ اس تناظر میں حساس قلم کاروں کا وادی کے کرب کو پیش کرنا فطری ہے اس صورت حال کو معاصر اُردو افسانہ نگاروں نے بڑی چابک دستی سے قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے جن میں نور شاہ، شبنم قیوم، ڈاکٹر ریاض توحیدی، دیپک کنول، وریندر پٹواری، عبدالغنی شیخ، ڈاکٹر ظہور الدین، خالد حسین، وحشی سعید، ڈاکٹر اشوک پٹواری، عمر مجید، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی، ترنم ریاض، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شبنم قیوم ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں نئے رجحانات اور نئی فضا کی عکاسی ہے۔ تخیلی تانے بانے بہت کم اور حقیقت پسندانہ عناصر بہت زیادہ پائے جاتے ہیں وہ بدلتی فضاؤں کے ترجمان ہیں۔اگرچہ شبنم قیوم پرانے افسانہ نگاروں کے صف میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن وہ آج بھی نئے لکھنے والوں کے ہم سفر بن کر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ شبنم قیوم کے تین افسانوی مجموعے ہیں جن میں "ایک زخم اور سہی" ۱۹۷۱ء اور "نشانات" ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئے۔ ۲۲ زیر نظر افسانوی مجموعہ "آزادی کی تلاش" ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے۔ ۲۳ نور شاہ اپنی کتاب "جموں وکشمیر کے اُردو افسانہ نگار" میں یوں قلمبند کرتے ہیں:

> شبنم قیوم کی زندگی نشیب وفراز سے گزری ہے اور یہ نشیب وفراز ان کی کہانیوں میں بھی نظر آتے ہیں ۔ان کے افسانوں میں درد اور تڑپ ہے۔ ۲۴

ریاست جموں وکشمیر کے عصر حاضر کے ایک اہم افسانہ نگار دیپک بدکی ہیں۔ان کے پانچ افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن کے عنوانات سے ہی کشمیر کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ جیسے "اُدھورے چہرے"، "چنار کے پنجے"، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی"، "ریزہ ریزہ حیات" اور "روح کا کرب" قابل ذکر ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں چُن چُن کر خوب صورت اور مناسب جملے استعمال کرتے ہیں۔انہیں ذبان وبیان پر قدرت حاصل ہے جس کی وجہ سے انہوں نے خوبصورت افسانے تخلیق کیے، دیپک بدکی کی کہانیاں حقیقت پر مبنی ہے وہ کچلے ہوئے اور خوف زدہ افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔

وریندر پٹواری افسانوی ادب میں ایک اہم نام ہیں ہیں۔ان کے نو افسانے مجموعے منظر عام پر آئے "ایک ادھوری کہانی"، "افق"، "آفتوں کے شہر میں"، "دائرے"، "دوسری کرن"، "بے چین لمحوں کا تنہا سفر"، "آخری دن"، "فرشتے خاموش ہیں" اور "لالہ رُخ" قابل ذکر ہیں۔انہوں نے جو کہانیاں تخلیق کیے ہیں ان میں درد وکرب کی ایک عجیب سی فضاء نظر آتی ہے۔ان کی کہانیوں کے پسِ منظر میں کشمیر ہر طرف نظر آتا ہے۔انہوں نے کشمیر کے جاری مصائب کو موضوع بنایا ہے۔ چناچہ وہ جدید تحریک سے وابستہ رہے اس لیے ان کے افسانوں میں استعارات، علامت اور تلمیحات کا غلبہ ملتا ہے۔وہ کشمیریوں کے ظلم وستم اور دہشت کو خوشیوں اور امن میں بدلنے کا خواہاں ہے۔انہوں نے اس سسکتی وادی کا کرب گھول کر اپنے افسانوں میں بھر دیا ہے۔

جموں وکشمیر کا ایک اور افسانہ نگار دیپک کنول ہیں۔ جو پہلے ڈی کے کنول کے نام سے افسانے ڈرامے لکھتے تھے ۔ان کے افسانوی مجموعے "برف کی آگ"، "پمپوش" اور "میرے گاؤں کا چنار" منظر عام پر آچکے ہیں۔انہوں نے کشمیری

پنڈتوں کی دربدری اور بے گھری پر افسانے لکھے ہیں۔ دیپک کنول رجائیت، تہذیبی و مذہبی رواداری، انسانیت اور مقصدیت کے روادار ہیں۔ ان کے یہاں دھرتی سے بچھڑ جانے کا غم، پسماندہ طبقات کے مسائل اور انسانی جذبات کے نرم گوشوں کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعہ "برف کی آگ" کے سبھی افسانے کشمیر کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں، جن میں مخبر ، تفتیش، شعلے، حیوانوں کی بستی، کراس فائرنگ اور سزا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نئے لکھنے والوں میں جو نام سامنے آرہے ہیں ان میں ناصر ضمیر، خالد کرار، شبنم طارق، ریاض ملک، اشوک پٹواری، راجہ یوسف، نذیر جوہر، شفیع ایاز، ڈاکٹر ریاض توحیدی، منصور احمد منصور، عمر مجید اور خواجہ فاروق رینزو کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

منصور احمد منصور ریاست جموں و کشمیر میں اُردو افسانے کا ایک اہم نام ہیں اور ان کے افسانے ریاست اور بیرون ریاست کے مختلف رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ "یہ بستی عذابوں کی" ان کا افسانوی مجموعہ ہے جس میں ۱۴ افسانے شامل ہیں۔ منصور احمد منصور کے اکثر افسانے وادی گُلپوش میں رونما ہوئے حالات وواقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ "یہ بستی عذابوں کی" ایک ایسا افسانوی مجموعہ ہے جس میں منصور احمد منصور نے وادی کشمیر کے ان حالات وواقعات کی عکاسی کی ہے جن سے ہر ایک کشمیری دوچار ہوا ہے۔ وادی کشمیر کے پُر آشوب دور میں انہوں نے جو کہانیاں قلم بند کیں ان میں کشمیریوں کی زندگی کی سچائیوں کی بھرپور عکاسی ملتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں سرزمین کشمیر اور وہاں کے لوگوں کی درپیش مسائل دکھ درد کو اولین جگہ ملتی ہیں۔ منصور احمد منصور نے اپنی تخلیقات، انشائیوں اور افسانوں میں وادی گُلپوش کے اُس درد و کرب کو پیش کیا ہے جس کا مشاہدہ ہر کشمیری کو ہے۔ منصور احمد منصور کے بارے میں نور شاہ یوں لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر منصور احمد منصور کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں کشمیر کی زندگی اور خاص طور سے عصری زندگی کی تصویریں ایک نئے انداز سے اُتارتے ہیں۔ کشمیر میں پھیلی ہوئی آگ اور بکھرے خون کی کہانی دہراتے ہیں۔ ان کی اکثر کہانیاں کشمیر کے المیہ اور کشمیریوں کی المناک داستان کی ترجمان ہیں۔ ۲۵

عمر مجید بھی عصر حاضر کے ایک مشہور و معروف افسانہ نگار مانے جاتے ہیں۔ ان کے افسانے کشمیر اور بیرون کشمیر کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ عمر مجید کا پہلا افسانہ "ایک بوڑھا وولر کے کنارے" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا اس کے بعد عمر مجید نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور ان گنت افسانے قلم بند کیے۔ "اُجالوں کے گھاؤ" اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ

تھا جو ۱۹۶۷ء میں منظر عام آیا جس سے ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔افسانوں کے علاوہ اُن کے دو ناول "یہ بستی یہ لوگ" ۱۹۷۰ء اور "درد کا دریا" ۱۹۷۲ء بھی شائع ہوئے ہیں۔۲۶

عمر مجید ریاست جموں وکشمیر کے دور جدید کے معتبر اور منفرد افسانہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ریاست جموں وکشمیر کے افسانوں ادب آج بھی اُن کا نام پوری شان وشوکت سے لیا جاتا ہے۔وادی کشمیر کے پُر آشوب حالات کے پس منظر میں انہوں نے افسانے لکھے ہیں جن میں "گمشدہ جنت"، شہر کا اغوا" اور "میری گلی کا غم" قابل ذکر ہیں۔ان کے کہانیوں کی ایک اور خصوصیت کفایت لفظی ہے وہ کم سے کم لفظوں میں پوری کہانی کو اس طرح سمو دیتے ہیں کہ قاری کو ان کرداروں میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔عمر مجید کے کہانیوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بے جھجک اور آزاد ہو کر لکھتے ہیں۔عمر مجید کے افسانوں کے بارے میں وادی کشمیر کے معروف افسانہ نگار نور شاہ لکھتے ہیں:

> عمر مجید کے افسانوں کا ایک الگ ہی انداز ہے۔وہ افسانے لکھنے کے ڈھنگ سے بخوبی واقف تھے وہ اپنے کردار زمیں کی کھردری پر تلاش کرتے تھے اور چُن چُن کر انہیں افسانوں میں قید کر لیتے تھے۔اسلوب کا ستھرا پن اُن کی کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔کشمیر، کشمیری اور کشمیریت ان کا محبوب موضوع رہا ہے۔۲۷

ریاست جموں وکشمیر کے اُردو افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے خواجہ فاروق رینزو کی شخصیت اور ادبی کاموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔انہوں نے افسانوں کے علاوہ ناول بھی لکھے لیکن افسانوی ادب کے میدان میں وہ زیادہ بہتر نظر آتے ہیں۔ان کے افسانوں کے دو مجموعے "ڈوبتے کنار" ۱۹۸۰ء اور "گرتی بلندیاں" ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکے ہیں۔۲۸ خواجہ فاروق احمد رینزو شاہ اپنے افسانوں میں وادی کشمیر کی خوب صورت مرقع جابجا ملتے ہیں۔انہوں نے سماج کے ٹھیکیداروں اور ایمان فروشوں کے حقیقی چہرے کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔وہ اپنے افسانوں کے لیے مواد روز مرہ زندگی سے اخذ کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے افسانوں میں زبان وبیان کی دل کش اور روز مرہ واقعات کو ان سے منسلک کر کے اس طرح پلاٹ کی ترتیب کرتے ہیں کہ کہیں بھی جھول کا احساس نہیں ہوتا۔بقول نور شاہ:

> خواجہ فاروق احمد رینزو شاہ اپنے افسانوں میں سوسائٹی میں مساوات اور برابری کی بات کرتے ہیں۔سماجی افراتفری اور بے چینی کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کو ہدف ملامت بناتے ہیں ،زندگی کے ان گنت گوشوں میں جھانک کر ان کی نقاب کشائی بھی کرتے نہیں۔۲۹

ڈاکٹر ریاض توحیدی کا شمار وادی کشمیر کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے انہوں نے جب افسانہ لکھنے کا آغاز کیا تو اُس وقت وادی کشمیر پُر آشوب دور سے گزر رہا تھا اس نئے دور نے جہاں ہر فرد کو متاثر کیا تو وہاں دانشور ادیب بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے اس کی فکر کی تربیت اُسی سماج اور ماحول میں ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ فنکار اپنے فن میں سماج کی مثبت اور منفی دونوں طرح کی عکاسی کرتا ہے اسی مانند ڈاکٹر ریاض توحیدی کے فکری ارتقاء کی تعمیر و تشکیل میں بھی ان کے ارد گرد کے ماحول اور معاشرے کا بڑا دخل رہا ہے۔ڈاکٹر ریاض توحیدی کو جب افسانہ لکھنے کی تحریک ملی تو اُس دور کے بہت سارے حالات وواقعات نے ان کے ذہن میں جگہ بنالی تھی۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے وادی کشمیر کے درد کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے ان کی اکثر کہانیوں میں وادی کشمیر میں ہونے والے ظلم وستم، عورتوں کی عصمت دری، نوجوان نسل پر ظلم و تشدد جیسے مسائل سے متعلق موضوعات ملتے ہیں۔وہ خود اپنے افسانوی مجموعے "کالے دیوؤں کے سایہ" میں چند باتیں کے عنوان سے اپنی افسانہ نگاری کے فکری اور تخلیقی رویوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہے:

> میں سمجھتا ہوں کہ جب ظالم کا تیشہ مظلوم کے ننگے بدن پر وار کرتا ہے تو وار سہتے سہتے مظلوم کے دل سے جو پر شور آواز نکلتی ہے وہ آواز ہمارے افسانوں میں بھی سنائی دینی چاہے۔افسانے میں اشاروں، کنایوں میں بات کرنا تو ٹھیک ہے لیکن سچائی کو بیان کرتے ہوئے مصلحت پسندی سے کام لینا میری فطرت کے خلاف ہے کیوں کہ میں لنگور کو انگور بنا کر پیش نہیں کر سکتا۔۳۰

لیاقت علی اپنی کتاب (جموں وکشمیر میں اردو ادب) میں ریاض توحیدی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر ریاض توحیدی کے افسانوں میں کشمیر کا درد وکرب، خون خراب اور ٹوٹتی ہوئی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔۳۱

خالد حسین کا شمار بھی عصر حاضر کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہیں۔اگرچہ خالد حسین بنیادی طور پر پنجابی زبان کے افسانہ نگار ہیں لیکن انہوں نے افسانوی سفر کا آغاز اُردو افسانے سے کیا۔ان کی اکثر کہانیاں ریاست کے اندرون اور بیرون ریاست کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ان کے افسانوں میں جہاں حقیقت اور رومان کا امتزاج ملتا ہے وہیں ان میں نفسیاتی اور جنسی پیچیدگی، مذہبی،، سیاسی عوامل کی کارفرمائی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے۔انہون نے لگ بھگ ہر موضوع پر قلم اُٹھایا مگر ان کے افسانوں کے غالب موضوعات میں ریاست جموں وکشمیر میں پیدا شدہ

حالات، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور تقسیم کے المیہ کی عکاسی، جنسی نفسیات کی تہوں کو کھولنے جیسے نازک موضوعات شامل ہیں۔انہوں نے سماج اور معاشرے میں پھیلی ہوئی ناسوروں کو بے نقاب کیا ہے۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں حالات خراب رہے اور خاص کر ۱۹۹۰ء کے بعد ریاست میں جو افراتفری اور بے چینی، دہشت گردی، عورتوں کی عصمت دری، معاشی اور سیاسی نابرابری، ناانصافی، بے روزگاری، عدم برداشت، ذات پات اور دھرم کے نام پر غیر فطری فتوی جاری کرنا وغیرہ جیسے موضوعات کے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگی میں پیدا ہوئے مصائب کو خالد حسین نے اپنے افسانوں کے موضوعات بنائے ہیں۔اس کے علاوہ صنف نازک کے مسائل اور مرد سماج کی بالادستی کے خلاف جا آوازیں اُٹھتی رہتی ہیں ان پر بھی خالد حسین نے بڑی بے باکی سے بات کی ہے اور عورت کو ایک مضبوط کردار کے طور پر پیش کیا ہے ۔اردو میں اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے "ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں" ۱۹۸۱ء "اشتہاروں والی حویلی" ۱۹۹۱ء اور "ستی سر کا سورج" ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آکر کافی داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ۳۲ خالد حسین کا آج بھی یہ ادبی سفر جاری وساری ہے۔ان کے افسانوں کے بارے میں نور شاہ لکھتے ہیں:

خالد حسین اپنی کہانیوں کو ذرا ہٹ کر ایک نئے انداز سے عنوان دیتے ہیں۔ ۳۳

ریاست جموں وکشمیر کے افسانوی ادب میں موجودہ دور کی خواتین افسانہ نگاروں کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ریاست میں اُردو افسانے کو یہ خواتین مالامال کر رہی ہیں۔ان کے افسانے زندگی کے متضاد پہلوں کا احاطہ کرتے ہیں ۔ریاست جموں وکشمیر کے خواتین افسانہ نگاروں میں ترنم ریاض کا نام اہمیت کا حامل ہیں۔وہ بیک وقت افسانہ نگار، شاعرہ ، محقق، نقاد اور مترجم بھی ہیں۔اگرچہ انہوں نے شعر وادب کے مختلف شعبوں میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ لکن بنیادی طور پر وہ ایک کہانی کار ہیں۔ان کے افسانوں کے موضوعات تروتازہ ہوتے ہیں دراصل وہ عصری اسلوبیاتی روّیوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں ایسے موضوعات در آتے ہیں جو اُن کی تنگ زمین کو وسعتوں سے ہم کنار کر دیتے ہیں۔ترنم ریاض نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی زندگی، اس کا درد و کرب کے مسائل کو فنکارانہ انداز سے اُبھارا ہے ۔انہوں نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی سے جڑے رنگارنگ مسائل اور حالات وواقعات کو پیش کیا ہے ۔وہ اپنی تخلیقات میں انسانی رشتوں کی پاکزگی اور دلی جذبات کے تقدس کو نہایت پر اثر اور بامعنی اسلوب میں پیش کرتی ہیں۔ترنم ریاض ایک درد مند دل رکھنے والی حسّاس اور ذہین خاتون افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں میں معاشرے میں ہونے والی نا انصافیوں، ظلم وجبر اور استحصال کی عکاسی خوب ملتی ہے۔ان کی کہانیوں کے کردار معاشرے کے وہ افراد ہیں جو ظلم و تشدد اور

استحصال کے شکار ہیں اور غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں مگر ان کی آہ و فریاد کسی نے بھی نہ سنی۔ ترنم ریاض کے چار افسانوی مجموعے "یمبرزل"، "ابابلیں لوٹ آئیں گی"، "میرا رخت سفر"، اور یہ تنگ زمین شائع ہو چکے ہیں۔

وادی کشمیر میں اُردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی سرینگر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے اب تک تین افسانوی مجموعے "چنار کے برفیلے سائے، "خاموش آسمان "اور "روزن پہ میرے چاند "شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانے جموں و کشمیر کے مختلف اخبارات اور رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کو بچپن سے ہی افسانے اور ناول سے دلچسپی رہی ہیں۔ انہوں نے وادی کشمیر کے پُر آشوب دور کے تعلق سے بھی افسانے لکھے ہیں۔ اُن افسانوں میں انہوں نے اُس سچائی کو بیان کیا ہے جس سے وادی گُلپوش اور کشمیریوں کی اصل درد بھری زندگی سامنے آتی ہے۔ نیلوفر ناز نحوی کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر ضروری واقعات سے پرہیز کرتی ہیں جس سے اُن کی کہانیوں میں اختصار اور سنجیدگی آتی ہے۔

معاصر افسانوی ادب کے منظر نامے پر نعیمہ احمد مہجور بھی ایک اہم نام ہے۔ نعیمہ احمد مہجور بھی سرینگر سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانوں سے ہی کیا ہے۔ ان کے افسانے ریاست کے مقامی اخبارات اور مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے تخلیق کردہ کہانیوں "آگ"، "سیاہ رات کی چاندنی"، "اس بستی کی رات"، سفید چاندنی وغیرہ آج بھی افسانوں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا ایک ناول بہ عنوان "دہشت زادی" بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ نعیمہ مہجور کی کہانیوں میں معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں، ظلم و جبر اور استحصال کی عکاسی خوب نظر آتی ہے۔ ان کے بارے میں نور شاہ لکھتے ہیں:

> نعیمہ مہجور اپنی کہانیوں میں معاشرتی، سماجی اور اقتصادی موضوعات کو پُر اثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ۳۴

موجودہ سائنسی دور میں انسانی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے پیش نظر ریاست جموں و کشمیر کے افسانہ نگار بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے موجودہ دور کی زندگی کی بے چینی، بے قراری اور بے سمتی کو علامتوں کے ذریعے ابھار کر اینٹی سٹوری، علامتی اور تجریدی افسانے تخلیق کیے ہیں۔ بغیر پلاٹ اور کردار کے منتشر خیالات کو یکجا کر کے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ آنند لہر کے افسانوں میں یہ اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ آنند لہر کا "راستے کا پہاڑ"، "وجود" اور "عدالت" وغیرہ اس ضمن میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ریاست جموں و کشمیر میں چند ایسے افسانہ نگار بھی ہیں جنہوں نے اس صنف اپنے انداز و اسلوب سے ریاستی عوام کو در پیش آنے مسائل کو موضوع بنایا۔ اور ریاست میں افسانے کی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بل کہ اس میں نئے نئے تجربے بھی کئے۔ ان میں جان محمد آزاد، یاسین فردوسی، اقبال نازشی، دیپک کول، غلام رسول آزاد، کلدیپ رعنا، وجے سوری اور دیپک بدکی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ افسانہ نگار موجودہ دور کے انسان کی کھوکھلی اور بے کیف زندگی کی علامتی اور تجریدی اسلوب میں پیش کر رہے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں کئی افسانہ نگار تیزی اور گرمی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان نئے افسانہ نگاروں کے ساتھ چند پرانے افسانہ نگار بھی اس صف میں طبع آزمائی کر کے نئے لکھنے والوں کی ایک اعتبار سے رہنمائی کر رہے ہیں۔ اور ریاستی سطح پر صنف افسانہ کو مزید فروغ بخش رہے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانے کے اس مختصر جائزے یہ پتا چلتا ہے کہ وہاں بھی اردو افسانہ نے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی منزل طے کی ہے اور وہاں کے افسانہ نگار اس صنف کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانے کا مستقبل تابناک ہے۔

حوالہ جات

۱۔جاوید اقبال شاہ،دیپک بدکی کی افسانہ نگاری،(سرینگر:میزان پبلشرز،۲۰۰۹ء)،ص۲۸۔

۲۔لیاقت علی،جموں وکشمیر میں اردو دب(۲۰۰۰سے۲۰۱۳)،(دہلی:ایم۔آر پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء)ص۲۱۔

۳۔عبدالقادر سروری،کشمیر میں اردو (جلد دوم)،(سرینگر:جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز،۱۹۸۲ء)ص۴۲۹

۴۔برج پریمی،جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما،(جموں:رچنا پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء)،ص۲۶۔۲۷۔

۵۔نور شاہ،جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار،(سرینگر:میزان پبلشرز،۲۰۱۱ء)،ص۲۱۔

۶۔عبدالقادر سروری،کشمیر میں اردو (جلد سوم)،(سرینگر:جموں اینڈ ایکڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز،۱۹۸۴ء)ص۱۶۳۔

۷۔قدوس جاوید،"جموں کشمیر میں اردو افسانے کے بدلتے رجحانات"مشمولہ شیرازہ (افسانہ نمبر)،۵۲(نومبر۔دسمبر۲۰۱۴ء)،ص۹۔

۸۔حامدی کاشمیری،ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب،(سرینگر:گلشن پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء)ص۸۱۔

۹۔نور شاہ،جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار،ص۴۴۔

۱۰۔ایضاً،ص۴۴۔

۱۱۔برج پریمی،جموں کشمیر میں ارردو ادب کی نشو و نما،ص۳۱۔

۱۲۔جاوید اقبال شاہ،دیپک بد کی کی افسانہ نگاری،ص۳۷۔۳۸۔

۱۳۔ایضاً،ص۴۰۔

۱۴۔ایضاً،ص۳۱۔

۱۵۔ایضاً،ص۳۸۔۳۹۔

۱۶۔عبدالقادر سروری،کشمیر میں اردو(جلد سوم)،ص۱۷۶۔

۱۷۔جاوید اقبال،دیپک بدکی کی افسانہ نگاری،ص۳۱۔

۱۸۔نور شاہ،جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار،ص۶۲۔

۱۹۔برج پریمی،جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما،ص۳۵۔

۲۰۔نور شاہ،جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار،ص۵۳۔

۲۱۔ریاض توحیدی،معاصر اردو افسانہ(تفہیم و تجزیہ)،(جلد اول)،دہلی:روشان پرنٹرس،۲۰۱۸ء)،ص۱۹۰۔

۲۲۔مشرف فیاض ٹھوکر،شبنم قیوم بحثیت افسانہ نگار(مقالہ برائے ایم۔اے،حیدر آباد سینٹرل یونی ورسٹی،۲۰۱۴ء)ص۱۳۹۔

۲۳۔شبنم قیوم،آزادی کی تلاش،(سرینگر:وقار پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)ص۲۔

۲۴۔نور شاہ،جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار،ص۱۱۳۔

۲۵۔ایضاً،ص۱۶۸۔۱۶۹۔

۲۶۔سلیم سالک،جموں و کشمیر کے منتخب اردو افسانے(پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک)،(سرینگر:میزان پبلشرز،۲۰۱۱ء)ص۱۹۹۔

۲۷۔نور شاہ،جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار،ص۲۶

۲۸۔عرفان احمد قریشی،رینزو شاہ کے افسانوں کا تحقیقی مطالعہ،(سرینگر:گلشن بکس،۲۰۱۱ء)ص۲۳۔

۲۹۔نور شاہ،جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار،ص۱۴۱۔

۳۰۔ریاض توحیدی،کالے دیو ؤں کا سایہ(افسانوں کا مجموعہ)،(سرینگر:میزان پبلیشرز،۲۰۱۴ء)ص۱۱۔

۳۱۔لیاقت علی،جموں میں اردو ادب،ص۶۷۔

۳۲۔ایضاً،ص۵۳۔۵۴۔۵۵۔

۳۳۔نور شاہ،جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار،ص۹۷۔

۳۴۔ایضاً،ص۳۵۔

باب دوم:

مسلم افسانہ نگاروں کے افسانوں میں ریاست جموں و کشمیر کے حوالے سے فکری و نظری مباحث کا مطالعہ

اس باب میں وادی کے مسلم افسانہ نگارروں کے افسانوں کا فکری و نظری مباحث کا جائزہ لیا جائے گا اور اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے گی کہ انھوں نے وادی کشمیر کی بدلتی ہوئی صورت حال کو اپنے افسانوں میں کس طرح بیان کیا اور وہ اس میں کس حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں بھی ادبی تحریکوں اور رجحانوں کے زیر اثر افسانے لکھے گیے۔ ریاست جمو ں و کشمیر کے پہلے باضابطہ افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی نے اپنے افسانہ نگاری کا آغاز رمانوی افسانوں سے کی۔ چونکہ ۱۹۹۰ء میں وادی ایک بار پھر سے حالات بگڑ گئے، سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی طور پر کافی تبدیلیاں رونما ہویں۔ اس دور کو وادی میں "گن کلچر" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ وادی کشمیرے کے نوجوان طبقے نے ظلم کے خلاف آواز اٹھایا اپنا بدلہ لینے کے لیے مجبورً انسل کو بندوق کا سہارا لینا پڑا۔ جس سے وادی میں ایک نئی جنگ چھیڑ گئی، ہر طرف لوٹ مار، گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ اس ساری صورت حال کو وادی کشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں نے بڑی ہنر مندی سے قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے وہ وادی کشمیر کا شیرازہ بکھرتے ہو دیکھ رہے تھے یہی وجہ ہے ان کے اندر سوئی ہوئی روح جاگ اٹھی ان کی سوچ و فکر میں کافی تبدیلیاں آئیں اور وہ شہر آشوب کے حالات اور نئی نسل میں پائی جانے والی بے چینی اور ناامیدی کے واقعات کو رقم کرنے پر مجبور ہوگئے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں اکثر وادی گلپوش میں پوش میں پیش آنے والے واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی کہانیوں کا تانا بانا بنا ہے جن میں شبنم قیوم، نور شاہ، ریاض توحیدی وغیرہ قابل ذکر ہے۔ انہوں نے ان حالات کو جیا اور ستم رسیدہ حالات واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

ریاست جموں و کشمیر میں ۱۹۹۰ء کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کے بارے میں شبنم قیوم نے کثرت سے افسانے لکھے جن میں، "منادی سے دستک تک"، "حالات کے تھپڑے"، "لہو پر لگا داغ"، وغیرہ ان کے مشہور افسانے ہیں۔ [۲] شبنم قیوم ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہے وہ عام زندگی سے مواد لیتے ہیں گرد و پیش پر ان کی گہری نظر ہے وہ جو کچھ بھی

اپنی انکھوں سے دیکھتے ہیں اس پر غور و فکر کرنے کے بعد ان کو اپنی کہانیوں کا موغوع بناتے ہیں۔ شبنم قیوم کے اکثر افسانے طویل ہوتے ہیں مگر طولت ہونے کے باوجود ان کی کہانیاں تسلسل سے آگے بڑھتی ہیں اور سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ان کے افسانوں کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بلا جھجک اور آزاد ہو کر لکھتے ہیں۔

"منادی سے دستک تک"

وادی کشمیر پچھلے برسوں سے جس پر اُشوب دور سے گذر رہا ہے اس کا فنی اظہار وہاں کے ادب میں بھی ہوتا رہا ہے۔ شبم قیوم بھی اپنی کہانیوں میں وادی کے اُس پُر آشوب ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں اس دور کے تعلق سے ان کے افسانوی مجموعہ "آزادی کی تلاش" اور "منادی سے دستک تک" کی کہانی میں بھی موجود ہے اس افسانے میں افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وادی میں بھارتی درندہ صفت حکومت نے اپنی فوج کے ذریعے معصوم کشمیریوں کے شکار کے لیے ایسے ایسے ہتھکنڈے استعمال کئے اور ایسے ایسے سازشیں رچائی ہے جس سے وادی کے ایک طبقے کی سوچ صلب ہو کر رہ گئی ہے اسی طرح اس افسانے کا مرکزی کردار محمد سلطان خان ہے ساری کہانی اسی کے ارد گرد گھومتی ہے ایک دن صبح بستی میں مسجد کے لاوڈ سپیکیر سے "کریک ڈاون" کا اعلان ہوتا ہے سب مردوں کو باہر آنے یعنی کھلے میدان میں جمع ہونے اور عورتوں کو گھر میں رہنے کی ہدایت دی جاتی ہے تو محمد سلطان کو اپنی بیوی سارہ اور بیٹی فہمیدہ کی عزت کے تار تار ہونے کا خدشہ اس کے ذہن میں آتا ہے جس کی وجہ سے وہ گھر سے باہر اور کریک ڈاون میں شامل ہونے سے کترا رہا تھا۔

> مقامی مسجد سے کریک ڈاؤن کا اعلان، بستی میں قہر نازل ہونے کی منادی تھی۔ یہ منادی بستی کے۔۔۔ کم سے کم چار جوانوں کی قربانی، سونا چاندی کی لوٹ مار، خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور زور زبردستی کی پیش گوئی تھی۔[1]

محمد سلطان کی بیوی اور بیٹی فہمیدہ بار بار ان کو کریک ڈاؤن میں جانے کی تاکید کرتے رہیں لیکن وہ شناختی پریڈ میں جانے سے انکار کرتا رہا حالانکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ اگر تلاشی کے دوران فوج نے مجھے گھر میں پایا تو مار پیٹ کے ساتھ جان سے بھی مار دیا جائے گا، اس کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات آرہے تھے:

> فہمیدہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، ماں بیٹی کو دبوچ لینے کا خیال، خان کے لیے ناقابل برداشت تھا، اس نے ارادہ کر لیا وہ باہر نہیں جائے گا۔ اس نے بیوی اور بیٹی کو نقدی اور جہیز صندق سے نکال کر کہیں چھپانے کو کہا۔[2]

اس اقتباس سے یہ نقط عیاں ہوتا ہے کہ کس طرح وادی کشمیر میں وار دی پوش غریب اور مظلوم لوگوں کو جمع پونجی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، کتنی عورتوں کی عصمت کو تار تار کیا جاتا ہے۔ تخلیق کار نے ان ظالموں کی تمام ناپاک حرکتوں کو اس کہانی میں بے نقاب کیا ہے جو آئے دن وادی گلپوش میں پیش آتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھروں میں گھس کر وحشیانہ حرکتیں کر کے گھر میں مختلف قسم کے ساز و سامان کو تباہ و برباد کر کے اور تلاشی کے بہانے نقدی رقم، سونا اور قیمتی سامان کو بندق کے نوک پر حاصل کرتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ تلاشی کے بہانے گھروں میں داخل ہو کر عورتوں کو اپنی حواس کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

ابھی محمد سلطان اور اس کی بیوی اور بیٹی جہیز کو چھپانے کی تدبیر کر رہے تھے کہ اتنے میں باہر دروازے پر دستک ہوئی ان کا دل دہک سارہ گیا ان پر خوف کی سی کیفیت طاری ہوئی وہ ہکا بکا کر کے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اس کے بعد افسانہ نگار نے محمد سلطان خان کے کردار کو پیش کر کے ایک بہادر اور غیرت مند باپ کی طرح اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر دروازے کی جانب بڑھنے لگتا ہے، ادھر اس کی بیوی اور بیٹی دونوں ایک دوسرے کو گلے لگا کر رو رہے ہیں کہ اب ہمارے سہارے کو ہم سے چھینا جائے گا لیکن جب محمد سلطان خان ہمت کر کے دروازہ کھولتا ہے تو اس کے بعد افسانہ نگار نے مرکزی کردار محمد سلطان کے خوف اور دہشت زدہ ماحول کی عکاسی یوں ظاہر کی ہے:-

> دستک سے دستک محمد سلطان خان جان لیوا حادثے کا شکار ہو جا رہا ہے، اس کی بیوی اور بیٹی جان لیوا حملے کے آثار دیکھ رہیں ہیں۔ خان نے ہانپتے کانپتے چل کر دروازہ کھولا تو دیکھا دروازے پر کوئی نہیں۔۔ ان کی ایک پڑوسن واپس جا رہی ہے غالباً اسی نے دستک دی تھی جواب نہ ملنے پر اب واپس جا رہی ہے[۳]

اس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وادی کشمیر میں ظلم و ستم کی انتہا اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ لوگوں کے دل و دماغ سے ڈر جاتا ہی نہیں ہے۔ افسانہ نگار نے ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۹۰ء بعد جو حالات وادی کشمیر میں رونما ہوئے انہوں نے وہاں کے عوام کو نہ سرف بے سہارا، بزدل اور مظلوم بنا دیا بلکہ وہ ذہنی مرض کے شکار بھی ہو رہے ہیں۔ اس بدلاو کا اندازہ اس وقت ہوا جب افسانے کا مرکزی کردار محمد سلطان خان کے گھر پر دستک کی آواز آئی تو اس دستک نے ان کے اندر اتنا خوف پیدا کیا جس سے وہ سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ دستک دینے والا کوئی اور نہیں بلکہ اس کی پڑوسن تھی لیکن افسانے کا مرکزی کردار محمد سلطان کے اس ڈر کے پیچھے ان کا ایک گھناؤنا اور تلخ تجربہ ہے جس تجربے کا وہ بار بار سامنا کرنے سے ڈرتا ہے شبنم قیوم نے اس کہانی کے ذریعے کشمیر میں ہونے والے ظلم و ستم کی منظر کشی اس انداز میں کی کہ قاری کو پڑھ کر وادی کشمیر میں ہونے والی ظلم و بربریت کا پورا خاکہ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

"لہو پر لگا داغ"

شبنم قیوم کا ایک اور افسانہ "لہو پر لگا داغ" ان کا بہترین افسانہ ہے اس افسانے میں افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے جب کسی انسان پر ظلم کی انتہا ہو جاتی تو اُس پر ایک جنون کی سی کفیت طاری ہو جاتی۔ اس کہانی میں تخلیق کار نے غریبوں پر ہو رہے ظُلم کا ذمہ دار اُن لوگوں کو ٹھہرایا جنہیں منتخب تو عوام کرتی ہیں مگر بعد میں وہ لوگوں کے لیے ہی دردِ سر بن جاتے ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار بشارت طلب علم ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کا ایک فرد بھی تھا۔ بشارت کا والد نور الدین سرکاری ملازم تھا وہ اپنے بچوں کو شاندار مستقبل بنانا چاہتا تھا لیکن حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی ایک دن وہ حسب معمول اپنے کام پر جا رہا تھا اچانک راستے میں دھماکہ ہوا جس سے وہ جسمانی طور پر ناکارہ ہوا۔ بشارت نے جب گھر کی حالت دیکھی تو اس کو برداشت نہ ہوا آزادی پسند ہو کر بھی اُس نے علیحدگی پسند قیادت کی طرف سے الیکشن بایئکاٹ پر عمل نہیں کیا اُس نے مقامی ،ایم۔ایل۔اے، کے حق میں نہ صرف ووٹ کا آستعمال کیا بلکہ گھر کے سبھی افراد سے بھی ان کے حق میں ووٹ بھی ڈلوائے کیونکہ مقامی ایم۔ایل۔اے۔ نہ صرف ان کو نوکری دلانے کا وعدہ کیا تھا بلکہ قسمیں بھی کھائی تھیں اسی ضرورت اور مجبوری کو لے کر بشارت نے ووٹ کا استعمال کیا:۔

> "ان کا ایم۔ایل۔اے، اب منسٹر بھی بن گیا اور جب انہوں نے وازرت کا عہدہ بھی سنبھالا تھا تب سے سے آٹھ مہینے گزر گئے ان آٹھ مہینوں میں درجنوں چکر لگانے کے بعد وزیر موصوف نے ملاقات تو دی البتہ سرکاری نوکری دلانے کے وعدے سے صاف مکر گئے۔[۴]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح سماج کے یہ ٹھیکیدار مظلوم اور بے بس لوگوں کس خون چوستے ہیں جس کی وجہ سے وہ گناہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اس کہانی میں افسانہ نگار کئی حقیقتوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح غریب اور لاچار لوگ اپنے نفس کو پالنے کے لیے جرم کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں اور سماج کے یہ ٹھکیدار ان لوگوں کو اس جال سے باہر نہیں آنے دیتے۔ افسانے کا مرکزی کردار بشارت نے آزدی پسند ہو کر بھی اپنے ضمیر کے ساتھ سودا کیا حالانکہ بشارت جانتے تھے ہماری آزادی کے دشمن اصل میں یہی لوگ ہیں جن کو ہم اپنا ووٹ دے کر چُنتے ہیں لیکن جب پیٹ کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے تو اس وقت انسان دوست اور دشمن کی تمیز بھول جاتا ہے بشارت بھی مجبوری اور لاچاری کی حالت میں اپنی نوکری کے خاطر یہ تمیز کھو چکا ہے مگر ان کا ضمیر اس اقدام پر بار بار ملامت کرتا ہے۔ اس کہانی میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب آدمی کے پاس اپنا اور اپنے خاندان کو پالنے کا کوئی ذریعے نہیں ہوتا تو ملک دشمن عناصر ان

کو قائل کر کے غلط راستے پر لگا دیتے ہے اور کشمیر کے تحریک آزادی کو کُچل کر رکھ دینے کے لیے لوگوں کو خریدنے کی کوشش کی۔ آزادی اور حق خودارادیت کے جزبے کو دبانے کے لیے وحیشی درندوں نے طرح طرح کے حربہ استعمال کیے ۔ شبنم قیوم نے اس افسانے میں نچلے طبقے کے لوگوں کو بیدار کروانا چاہتے ہیں جو ان وحیشی درندوں کے ناپاک حرکتوں کے شکار ہوتے ہیں۔

"حالات کے تھپیڑے"

شبنم قیوم کا افسانہ "حالات کے تھپیڑے" میں بھی وادی کشمیر کے بڑھتے ہوئے خوف اور دہشت گردی کو موضوع بنایا ہے۔ وادی کی بدامنی اور موت کی جاری رقص سے ہر ذی نفس بوکھلایا ہوا نظر آتا ہے لوگوں کا امن وسکون برباد ہو کر رہ گیا ہے گھر سے رخصت ہوتے وقت والدین خوف زدہ ہوتے ہیں کہ ان کے بچے گھر سلامت سے واپس پہنچ پائیں گے کہ نہیں چونکہ خوف وادی کشمیر کے ہر شخص کے لیے ذہنی مرض بن چکا ہے خوف ہر جگہ ان کا پیچھا کر رہا ہیں۔

زیر نظر افسانے میں بھی ایک مولوی صاحب کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے افسانے کا مرکزی کردار مولوی صاحب ہے ساری کہانی ان ہی کے ارد گرد گھومتی ہے مولوی صاحب استاد کے پیشے سے ریٹائر ہو چکے تھے بڑے ہی ایماندار اور دیندار قسم کے انسان تھے مگر کشمیر میں بڑتی ہوئی دہشت گردی نے ان کے ذہن پر بھی خوف کے اثرات چھوڑے ہے مولوی صاحب کی دو بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا ایک بیٹی سال بھر کے اندر ہی بیوہ ہو گئی مولوی صاحب کے داماد کو ٹاسک فورس کی گشتی پارٹی نے خان ڈریس اور مُنہ پر گھنی داڑھی دیکھ کر اس کو پکڑ کے طرح طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور کچھ دنوں کے بعد ان کی لاش کنٹرول روم کے سُپرد کر دی گئی اس دردناک واقعہ نے مولوی صاحب کو ذہنی مرض میں مبتلا کر دیا۔ مولوں صاحب نے جب اپنے بیٹے منیر کے چہرے پر بھی داڑھی دیکھی تو وہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئے۔ مولوی صاحب نے جب بیٹے منیر کی چہرے پر بھی داڑھی دیکھی تو وہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئے بیٹے کے چہرے پر نظر پڑھتے ہی اپنے داماد کے کی موت کا واقعہ بار بار یاد آتا تھا اس لیے مولوی صاحب نہیں چاہتے تھے میرا بیٹا دہشت گردوں کے ظلم وبربریت کا شکار ہو جائے۔

> مولوی صاحب کو بیٹے منیر احمد کی داڑھی نے اس قدر دلگیر اور پریشان کر دیا اس سے اپنے داماد کا انجام آنکھوں کے سامنے آکر تڑپانے لگا اور داماد کی یاد آنے سے منیر کی داڑھی سے مولوی اور زیادہ خوف زدہ ہو گئے۔[۵]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات صاف عیاں ہوتی ہے کہ جب لوگوں کو اپنی زندگی پر سے اعتبار اُٹھ جاتا ہے تو ان کو کوئی امید بھی نظر نہیں آتی تو انسان ذہنی اُلجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے جس طرح افسانہ نگار نے اس کہانی میں مولوی صاحب کے کردار کو پیش کر کے وادی کشمیر کے اُن ہزار والدین کی نمائندگی کروا کر اُس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ والدین کس طرح ظالمین کے ظلم سے ذہنی بیماریوں کے شکار ہو رہے ہیں۔

اب مولوی صاحب ان حالات کو دیکھ کر اپنے ماضی کو یاد کر کے سوچنے لگا وہ بھی کیا زمانہ تھا جب وادی کشمیر میں داڑھی رکھنا باعث فخر سمجھا جاتا تھا لیکن آج اسی وادی میں داڑھی رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے ان ہی خیالات کو لے کر مولوی صاحب بڑے پریشان رہے بستر میں بھی صرف کروٹیں بدلتے رہے جونہی آنکھ لگ جاتی تھی تو ان کو ڈراونی خواب آتے تھے صبح جب نیند سے بیدار ہوا تو مسجد کے لواڈ سپیکر سے کریک ڈاؤن کا آعلان ہوا پہلے تو وہ اندر ہی اندر سوچنے لگا یہ میرا وہم تو نہیں ہے لیکن جب آعلان مقرر ہوا تو اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی ہمیں بچاؤ میرے بیٹے منیر کو بچاؤ اسی کے ساتھ بے ہوش ہو گئے اس کے بعد افسانہ نگار نے ان دہشت گردوں کے خوف ناک منظر کا یوں نقشہ کھنچا ہے:

> "ورنڈے میں دو ہٹے کٹے جوانوں کو دیکھ کر فوجی جوان ان پر ٹوٹ پڑے ان کو دبوچ لیا گیا نہ کچھ سنا نہ کچھ بولا بس مرتے پیٹے رہے اور پھر گھسٹتے ہوے اپنے ساتھ لے گیے۔ کہاں اور کدھر؟ کوئی پتہ نہ چل سکا۔[۶]

یہ افسانہ محض واقعاتی نہیں بلکہ اس کہانی میں افسانہ نگار نے وادی کشمیر کے آج کی تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے ۔وادی کشمیر میں ظُلم و ستم کی انتہا اس قدر بڑھ گئی ہے کہ والدین کے سامنے بغیر کسی خطا کے ان کے پیاروں کو مارتے پیٹتے اور پھر گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے جا کر غائب کرتے ہے اس افسانے کا مرکزی مولوی صاحب کے دو بیٹے منیر اور نصیر نہ صرف اس کڑے سچ کی علامت ہے بلکہ یہ ان سینکڑوں معصوم کشمیریوں کے خون ناحق کی بھی علامت ہیں جنہیں ظالم حکمرانوں نے غائب کر کے بے نام قبروں میں ہمیشہ کے لیے سُلا دیا اور ان کے گھر والے برسوں سے انصاف گھروں کے دروازے کٹھکٹا رہے ہیں کہ شاید وہاں سے ان کے پیاروں کی واپسی کی کسی خوش خبری کا آعلان ہو جائے ش۔ شبنم قیوم نے اس کہانی کے آخر میں ان کے لواحقین کی منظر کو یوں بیان کیا ہیں:

> "آج مولوی صاحب کی بیوی اور اس کی بھولا پتہ جوانوں کی بازیابی کے لیے دھرنے پر بیٹھی ہیں وہ بھی "شیر کشمیر" یادگار پارک میں جس کی سیاست اور حکمرانی نے ایک ماں کے لخت جگر کو، ایک بیوی کے شوہر کو، ایک بہن کے بھائی کو، ایک بیٹی کے باپ کو لاپتہ لاپتہ کروایا۔[۷]

اس طرح یہ کہانی اپنی انجام کو پہنچتی ہے جس کا مطالعہ کر کے قاری کا ذہن متاثر ہو جاتا ہے۔

وادی کشمیر کے پُر آشوب دور کے تعلق سے "نور شاہ نے بھی افسانے لکھے ہیں۔ نور شاہ کا افسانوی مجموعہ "کشمیر کہانی" ۲۰۱۴ء میں طبع ہونے والی ان کی تازہ ترین کتاب ہے "کشمیر کہانی" دراصل وادی میں ہونے والے افسوس ناک حالات واقعات کی منظر کشی کرتی ہیں۔ کشمیر کہانی میں نور شاہ کی سوچ اور انداز فکر پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے ان کے افسانے معاشرے کی برہنہ سچائیوں کا احاطہ کرنے میں نڈر اور بے باک حقیقت کا مظہر ہیں۔

"لمبی عمر کی لکیریں" :

افسانہ "لمبی عمر کی لکیریں" کا شمار نور شاہ کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہیں اس کہانی میں نور شاہ نے وادی کشمیر کے روزمرہ حالات واقعات کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے اس افسانے کی شروعات ایک ایسے المناک اور دل دہلانے واقعے سے ہوتی ہے جس کو پڑھ کر پوری کائنات روپڑتی ہے۔ افسانہ "لمبی عمر کی لکیریں" کا موضوع بھی ایک ایسے طالب علم کی موت ہے جو نہ صرف خود گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہے بلکہ اس کے کتابوں کے سفید ورق بھی سرخ ہو چکے ہیں۔ وادی کشمیر میں پھیلی ہوئی دہشت گردی اور اس کے روک تھام میں فوجی دستوں اور مجاہدینوں کے درمیان مڈبھیڑ میں ایک معصوم طالب علم کی موت کو تخلیق کار نے چسم دید گواہ کے طور پر یوں بیان کیا ہے :-

> "سامنے سڑک پر دس بارہ سالہ ایک لڑکے کی لاش پڑی تھی، لت پت بہت خون بہہ چکا تھا۔ کراس فائرنگ میں اپنی جان کھو چکا ہے اس کی کتابوں سے بھرا بستہ چھلنی ہو چکا ہے اور کتابیں سڑک پر بکھری پڑی تھی۔[۸]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وادی کشمیر کے حالات کب کون سی کروٹ لیں گے کوئی بھی انسان کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ وادی کشمیر پچھلے کئی صدیوں سے جہاں ایک طرف ایک لاکھ سے زیادہ کشمیری لوگوں کو ابدی نید سُلائے گئے وہاں دوسری جانب اسکولی بچوں کو بھی بڑی بے دردی سے آگ برستی گولیوں کا نشانہ بنایا جارہا ہیں یہ صرف ایک طالب علم کی موت کا قصہ نہیں ہے بلکہ وادی کشمیر میں میں تو ایسے ہزاروں طلب علم ہیں جو بھارتی بھڑیوں کی بربریت کے شکنجے چڑھ کر ہمیشہ کے لیے ابدی نید سو گئے ہیں یہ کہانی صرف ایک گھر کی کہانی نہیں بلکہ وادی کشمیر میں شاید ہی کوئی ایسا جگہ ہو جہاں گزشتہ کئی برسوں سے وادی سے تعلق رکھنے والا ہر ذی جان بربریت سے اپنا پیچھا نہیں چھڑوا سکے وادی گلوش میں ظلم و ستم کی یہ کہانی نہ صرف دل دہلا دینے والی کہانی ہے بلکہ کوئی بھی درد دل رکھنے والا انسان تڑپ اُٹھتا ہیں۔

"کرب ریزے":

وادی کشمیر کے پُر آشوب دور کے تعلق سے نور شاہ کی ایک اور کہانی "کرب ریزے" شاہکار کہانی ہے ۔ نور شاہ نے اس افسانے میں بھی ریاست جموں و کشمیر میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی عکاسی کی ہے اس کہانی کا مرکزی کردار نورا اعلیٰ تعلم حاصل کرنے کے لیے لندن چلی جاتی ہے جب وہ بارہ بارس کے بعد اپنی ریاست میں وارد ہوتی ہے تو اس سے ہر چیز بکھری بکھری نظر آتی ہے وہ اپنی ہی گھر میں، اپنے ہی زمین پر خود کو تنہا اور اجنبی محسوس کرتی ہے اس کو ہر طرف درد بھری چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیتی ہیں راستے میں آتے آتے اس کو وہ پُرانے مقام یاد آتے ہیں جگہ جگہ پر گاڑی روک کر ڈرائیور سے پوچھتی یہاں میرا اسکول ہوا کرتا تھا جہاں پر میں نے اپنی بچپن کی خوش حال زندگی بسر کی تھی پھر نورا وادی کشمیر کے حالات دیکھ کر اپنے آپ سے مخاطب ہوتی ہے اور کشمیر کے موجودہ صورت حال کو یوں بیان کرتی ہیں:

> "جب میں یہاں سے گئی تھی تب میرا کشمیر رنگ رنگ کے پھولوں کا سندر خوبصورت باغ تھا، تب یہ پھول میرے اپنے تھے، تب یہ نہ میرے لیے اجنبی تھے نہ میں ان کے لیے پرائی تھی۔۔۔اب جب میں بارہ برس بعد اپنے کشمیر کو دیکھ رہی ہوں تو مجھے سب کچھ پرایا سا لگتا ہے سب کچھ بدل گیا ہے۔9

نورا جب گھر کے دروازے پر پہنچتی ہے تو گھر میں داخل ہوتے ہی پورے گھر کی فضا غم اور درد میں تبدیل ہوتی نظر آرہی تھی نوراجب اپنے بھائی کے بارے میں سُنتی ہے کہ میرے بھائی کو ظلموں نے بڑی بے دردی سے مارا ہے تو وہ اپنی بھابی سے چیختی چلاتی ہوئی سوال پوچھتی ہے میرے بھائی کو کیوں مارا گیا؟ میرے بھائی کا جرم کیا تھا؟ میرے ہنستے بستے گھر کو کس نے آگ لگادی؟ تو اس کی بھابی نورا کو جواب دیتی تم جو کہہ رہی ہو وہ سچائی ہے اور جو تم دیکھ رہی ہو وہ حقیقت ہے:

> جب تمہارا بھائی اذیتیں دے دے کر مار دیا گیا تب مجھے بہت دکھ ہوا تھا نورا اور اب۔۔۔میں اکیلی نہیں ہوں ، مجھ جیسی کتنی خواتین ہیں جو میری طرح حالات اور واقعات کا سامنا کر رہی ہیں۔10

افسانہ نگار نے اس کہانی میں جہاں ایک طرف انہوں نے وادی کشمیر کے رنگا رنگ خوبصورتی کا ذکر کیا ہے وہی دوسری جانب وادی کے درد کو بھی بڑے دل سوز انداز میں پیش کیا ہے وادی گُلپوش میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب خوش حال اور پُر سکون ماحول تھا لیکن حالاتوں نے کروٹ ایسی لی کہ پورا کشمیر ظُلم کے آگ میں جھلس رہا ہے۔ افسانہ نگار نے نورا کے کردار کو پیش کر کے وادی کے اُن ماؤں اور بہنوں کی دکھ درد کی داستان کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جن کے سہارے ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجل ہو گئے ہیں۔

نورا کو جب یقین ہو جاتا ہے کہ میرے بھائی کو قابض فوج نے مارا ہے تو وہ اپنے ابو سے اپنے بھائی کے قبر کے بارے میں پوچھتی ہے کہ میں اپنے بھائی کی قبر دیکھنا چاہتی ہوں اس مٹی کو چھونا چاہتی ہوں تو وہ اپنی بیٹی کو جواب دیتا ہے نورا ان بے شمار قبروں میں کیسے تلاش کرو گی اپنے بھائی کی قبر کیوں کہ وادی کشمیر میں ہزاروں گمنام قبریں ایسی موجود ہے جن میں بیک وقت ایک سے زیادہ لاشوں کو مظالم نے ایک ہی قبر میں دفن کیا ہے۔اس طرح نور شاہ نے "کرب ریزے" میں اُن گمنام قبروں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس سے وادی میں اُن ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے ظُلم و ستم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔وہ مائیں آج بھی اپنے لخت جگروں کی، بہنیں اپنے بھائیوں کی، بیویاں اپنے شوہروں کے راستے دیکھ رہیں ہیں لیکن آفسوس وہ اس کڑوی سچائی سے بے خبر ہیں کہ وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے کیوں کہ ان کے جسم بے نام قبروں میں خاک ہو چکے ہیں۔

"بے زمینی کا کرب"

افسانہ "بے زمینی کا کرب" کشمیر میں ہو رہے ظلم و بربریت پر مبنی کہانی ہے۔اس افسانے میں نے نور شاہ نے ایک ایسے گھر کی کہانی پیش کی ہے جو انڈین آرمی کے ظُلم و بربریت کا شکار ہوئے۔اس افسانے میں افسانے میں وادی کشمیر کا درد پوشیدہ ہے وہ درد اب کشمیر کے ہر انسان کی زندگی کا حصّہ بنا ہوا اسی طرح اس افسانے کا مرکزی کردار دسویں جماعت کا طلب علم امجد ہے وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔شادی کے دس برس بعد ہزاروں منتوں اور دعاؤں کے بعد اللہ نے ایک بیٹا دیا تھا ان کا شمار اسکول کے ذہین ترین طلبا میں ہوتا تھا اس کے شب و روز کا معمول پڑھنا لکھنا اور اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنا کودنا ہوتا ہے۔ایک روز جب وہ حسب معمول اسکول سے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو امجد نے اپنے گلی کے نکڑ پر چند وردی پوشوں کو دیکھا جو راہ چلتے ہوئے لوگوں سے جامہ تلاشی لے رہے تھے جب وہ گلی کے قریب پہنچا تو ایک وردی پوش نے ہاتھ کے اشارے سے رُکنے کو کہا تو وہ رُک گیا وردی پوش نے اُس سے پوچھا بیگ میں کیا ہے؟ اور کہاں سے آرہے ہو؟ وہ جواب میں کہتا ہے میں اسکول سے آرہا ہوں اور بیگ میں کتابیں ہیں۔وردی پوش معصوم امجد کو عجیب و غریب سوالات پوچھتے ہے جس سے وہ ناآشنا ہوتا ہے اس سے نہ دہشت گرد کے خوف ناک الفاظ کی جان کاری ہوتی ہے اور نہ ہی پستول یا بارود کی پہچان۔اس کے بعد تخلیق کار نے مرکزی کردار "امجد" کی معصومانہ سوچ اور وردی پوش کی دہشت پسند سوچ کی عکاسی یوں ظاہر کی ہے۔امجد کا جواب سن کر وار دی پوش پھر پوچھتا ہے:

"کچھ اور بھی ہو گا"

"نہیں تو۔صرف کتابیں ہے۔" امجد نے معصوم لہجے میں میں جواب دیا"

"میرا مطلب ہے، پستول۔۔ گولہ بارد؟،،۔۔

"یہ گولہ بارد کیا ہوتا ہے،،امجد نے پوچھا:"وردی پوش نے کوئی جواب نہ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے وہاں جانے کے لیے کہہ دیا۔۔۔

جاتے جاتے وردی پوش کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی،"دہشت گرد کے اولاد،،۔۔۔۔

"یہ دہشت گرد کیا ہوتا ہے،،اس نے من ہی من میں سوچا۔[11]

گھر لوٹنے پر بھی امجد کے کانوں سے "دہشت گرد،،کے الفاظ ٹکرا رہے تھے گھر پہنچتے ہی اُس نے جب یہ ساری داستان اپنے والدین کو سُنائی وہ یہ سن کے حیران وپریشان ہوگئے لیکن خاموش رہے، خوف وڈر کے تاثرات ان کے انکھوں میں عیاں تھے ایک رات جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو دور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا اب تو امجد گولہ بارود، فائرنگ، دھماکے، تلاشیاں، گرفتاریاں اور کریک ڈاؤن سے آشنا ہو چکا تھا ایک صبح جب بستی کا کریک ڈاؤن کیا گیا تو شناختی پریڈ کے دوران وردی پوش افراد نے معصوم امجد کو بھی فوجی گاڑی میں ڈال دیا لوگ یہ دہشت ناک صورت حال دیکھ کر احتجاج کے لیے اگے بڑھنے لگے وردی پوشوں نے ہتھیار کے زور پر انہیں روک دیا امجد کا باپ اپنے بیٹے تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا وہ چلانے لگا اور اپنے معصوم بیٹے کی گرفتاری دیکھ کر وردی پوشوں سے منت سماجت کرنے لگا:

یہ بے قصور ہے، کم سن ہے، اس سے کیوں لے جا رہے ہوں کہاں لے جا رہے ہو،،!! لیکن جیپسی امجد کو لے کر نکل چکی تھی[12]

اس کے بعد معصوم امجد کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک آفیسر سے دوسرے آفیسر لیکن کسی بھی سرکاری ادارے یا پولس اسٹیشن سے کوئی مناسب کارئی نہیں کی گئی آخر کار امجد کا والد اس فوجی کیمپ کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوا لیکن جب وہ اپنے گمشدہ بیٹے کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہاں سے جواب ملا کہ ان لوگوں کو پوچھ تاچھ کے بعد کب کا رہا کیا گیا ہیں اس کے بعد افسانہ نگار نے جس دردانگیز طریقے سے امجد کے باپ کی بے بسی اور فوجیوں کی غیر انسانی تیور کو ظاہر کیا ہے وہ کشمیر کی سینکڑوں گمشدہ افراد کی درد بھری کہانی کا ایک کڑوا سچ ہے:-

"تو میرا بیٹا کہاں ہے،،۔اس نے پوچھا

"ہمارے پاس نہیں ہے، وہ کہاں ہے ہم نہیں جانتے اس سے تلاش کرنا اب تمہارا کام ہے ہمارا نہیں[13]

TH 03173

اس افسانہ میں افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وادی کشمیر میں قابض فوج کے ہاتھوں چھوٹے بچے بھی محفوظ نہیں ہے یہ ایسی خوف ناک داستان ہے جو خون آہوں اور سسکیوں سے عبارت ہے اور جو جموں وکشمیر کے طول عرض میں بکھری ہوئی ہے۔ جس طرح افسانے کا مرکزی کردار امجد پر قابض فوج نے ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے اسی طرح انھو ں نے لاکھوں کشمیریوں کو دبانے کے لیے ظلم کے ایسے ایسے پہاڑ توڑ ڈالے جس نے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کو مجبور کیا کہ وہ بندوق اُٹھالیں اور یہ سب اس وجہ سے ہو رہا ہے کیوں کہ قابض فوج کو کالے قوانین کا سہارا دیا گیا ہے اور وہ اپنی رٹ قائم کرنے کی خاطر کوئی بھی حد پار کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔

"مجروح قافلے کی داستان"

نور شاہ نے زیادہ تر کہانیاں کشمیر پر لکھی ہیں ان کے کہانیوں میں جہاں کشمیر کے خوبصورت مناظر کو اپنی فنی بصرتوں سے رنگارنگ انداز میں پیش کیا ہے وہی دوسری طرف کشمیر میں آئے دن ہونے والی ظلم وزیادتی جبر استحصال کو بڑے کرب ناک انداز میں پیش کیا ہے انہوں نے کشمیر میں رونما ہونے دردناک حالات وواقعات کی بہترین عکاسی کی ہے اسی طرح ان کی علامتی کہانی "مجروح قافلے کی داستان" درد دل رکھنے والے قاری کو اس نام سے ہی درد وکرب کی فیضا محسوس ہونے لگتی ہے۔ نور شاہ نے اس کہانی میں کشمیریوں کے درد کو بڑے موثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔انہوں نے اس کہانی میں دو علامتی کردار "ابابیل اور باز" کو پیش کر کے کشمیر میں ہونے والی حقوق کی پامالیوں کو منظر عام پر لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ابابیل کو مظلوم کشمیریوں کی نمائندگی کروائی ہے اور باز ریاست جموں وکشمیر پر مسلط جابر و ظالم طبقہ کی نمائندگی کروائی ہے افسانہ نگار نے اس میں ابابیل کے کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے وادی گلپوش کے لوگ ہمیشہ سے امن پسندی کے داعی رہے ہیں کشمیر کو خوش حال اور امن کا گہوارہ بنانے کے لیے وہاں کے باسیوں نے ہمیشہ کوشش کی ہیں جب اچھی طرح سے کشمیر میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تو نہ جانے وادی کشمیر کس کی نظر بد کی شکار ہو گیا ہے جس کشمیر کو دنیا میں جنت نظیر کہا گیا آج ظالمین نے اپنے طاقت کے بل پر مظلوموں کی آواز کو دبال کر اپنا جابرانہ قبضہ کر کے ان کے گھروں کو مسمار کر کے جنت نما کشمیر کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا:۔

> "موسم بہار کے آمد کے ساتھ نئے حوصلے اور نئے پاکپن کے ساتھ گھونسلے بنانے مصروف ہو گئیں،
> کبھی آس پاس اور کبھی دور دراز سے چُن چُن کر تنکے جمع کرنے کے بعد وہ تنکا تنکا جوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو

نیا روپ دینے میں لگیں۔ بہت دنوں کی ان تھک محنت کے بعد ان کے گھر بن گئے ان کے گھونسلوں میں
حرارت اور حرکت آگئی زندگی کے آثار پیدا ہو گئے [۱۴]

جب ایک روز ابابیل شام کو گھر آئے تو ابابیل نے موٹے باز کو دیکھا وہ ان کے گھروں کو جھانک رہا تھا ابابیل نے نے باز کو کہا آپ شاید یہاں غلطی سے آئے ہیں یہ جو گھر آپ دیکھ رہے ہیں یہ ہمارے گھر ہے ہمارے آشیانے ہے باز نے ابابیل کو جواب دیا یہ سجے سجائے گھر تمہارے نہیں یہ گھر میرے ہیں اور ان پر رہنے کا حق بھی میرا ہیں۔ ابابیل باز کو سوال کرتا ہے:

"صرف تمہارے کہنے سے وقت کا پہیہ رُک تو نہیں سکتا"

"بے وقوف ہو تم سب،، باز نے کہا۔ "وقت کا پہہ رک بھی سکتا ہے"

"وہ کیسے ایک عمر رسیدہ ابابیل نے پوچھا"

"تمہاری اس جنت کو کھنڈر میں تبدیل کر کے تمہارے گھروں کو مسمار کر کے "[۱۵]

یہ افسانہ محض واقعاتی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے اس افسانے میں نور شاہ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب بھارت نے ۱۹۴۷ء میں ریاست جموں و کشمیر پر فوجیں اتار کر جبراً قبضہ کر کے قتل و غارت، لوٹ مار اس کے ساتھ ساتھ گھر جلائے گئے بستیاں اجاڑی گئیں نوجوان نسل کو جیلوں میں بھر کر سڑایا گیا۔ افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کس طرح ظالمین نے طاقت کے نشے میں مظلوم کشمیریوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے بندوق کے نام پر نہ صرف لوگوں کو ہراساں کیا گیا بلکہ ان کے مال و دولت پر بھی جبری قبضہ کر کے لوٹ لیا گیا اس قسم کی ظالمانہ اور جابرانہ کاروائیاں کر کے مظلوم کشمیریوں کے جذبات اور احساسات مجروح کئے گئے کسی نے احتجاج کیا تو اس کو حراست میں لے کر تشدد کیا گیا یعنی کشمیریوں کو غلام سمجھا گیا اور غلام سمجھ کر یہ تاثر دیا گیا جو غلام ہوتا ہے وہ حقوق کا مستحق نہیں ہوتا اور نہ ہی حقوق کا کے لیے مطالبہ کر سکتا ہے اس طرح کے مسائل کو نور شاہ نے اس کہانی میں اجاگر کیا ہے جس کو پڑھ کر قاری اپنے آنسوں پر بڑی مشکل سے قابو رکھ پاتا ہے۔

"قطرہ قطرہ سمندر"

کشمیر کہانی" کا ایک اور افسانہ "قطرہ قطرہ سمندر" نور شاہ کا یہ ایک اہم اور منفرد افسانہ ہے یہ افسانہ بھی کشمیر کے حالات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے اس کہانی میں نور شاہ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح کشمیر کہ تحریک آزادی کو دبانے کے لیے کشمیری کو گرفتار کر کے ان پر ذہنی و جسمانی تشدد کر کے زندگی بھر کے لیے مفلوج کیا جارہا ہے۔اس کہانی میں نور شاہ نے اکرم نام کے کردار کو کشمیر کے نوجوان نسل کے نمائدگی کے طور پر پیش کر کے اس کے ساتھ ہونے والی ظلم و بربریت کو بروئے کار لا کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کس طرح وادی کشمیر میں نسل کشی کی جارہی اور اس خطہ میں مظالم کی انتہا کہاں تک پہنچ چکی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار اکرم جس کی عمر اٹھارہ سال ہے جس کو کریک ڈاؤن کے دوران سیکورٹی فورسیز کے ذریعے حراست میں لیا جاتا ہے اور پھر پندرہ دن تک اس کو نامعلوم جگہ پر رکھا جاتا ہے جب وہ پندرہ دن کے بعد گھر آتا ہے تو اکرم بالکل ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے گھر میں عجیب طریقے سے رہنا اکرم کے ماں کے لیے ناقابل قبول ہی نہیں بلکہ ناقابل برداشت بھی تھا اکرم کی ماں جب اس سے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے تو ڈاکٹر اکرم کو دیکھ کر ان کی ماں سے پوچھتا ہے حالات خراب ہونے کے دوران اکرم کے ساتھ کوئی کوئی ایسا حادثہ تو پیش تو نہیں آیا۔اکرم کی ماں پر نم آنکھوں سے جواب دیتی ہے:

> "کیا بتاؤں کیسے بتاؤں بے تحاشا رونے کو من کر رہا ہے۔۔تب کریک ڈاؤن کے دوران اکرم کو بھی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ ایک سفید رنگ جیپسی کے سامنے سے گزرنا پڑا اور کریک ڈاؤن اُٹھنے سے پہلے ہی اکرم ہمارے نظروں سے دور ہو چکا ہے تھا۔۔پھر جب پندرہ دن کے بعد اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی تو وہ بہت تھک چکا تھا۔۔وہ ہمیں پہچانے کی کوشش کر رہا تھا پھر وہ خاموش رہنے لگا، ڈرا ڈرا سا، کمرے کی کھڑکی کھولنے سے منع کرتا تھا، آنگن میں جانے سے ہچکچاتا تھا۔[۱۶]

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وادی کشمیر کے لوگوں پر اس قدر خوف کا عالم ہے کہ لوگ اس دہشت سے پناہ مانگتے ہیں اپنے گھروں میں بھی ڈرے سہمے چھپ کر بیٹھیں ہیں لوگ گھروں سے باہر نکالتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ جانے کب وہ بھی اس دہشت گردی کا شکار ہو جائیں روزانہ کسی نہ کسی گھر میں صف ماتم بچھی ہوتی ہے ان دہشت گردوں کی کاروائیوں سے دس سالہ معصوم بچے بھی ان کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر نے جب اکرم کی جانچ پڑتال کی تو انھوں نے ان کے ماں کو کہا اس کا ذہن کسی گہرے صدمے کی وجہ سے مفلوج ہو گیا ہے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا ہے ڈاکٹر نے اکرم کی ماں کو بتایا میرے خیال میں اکرم کو حراست کے

دوران جسمانی نہیں بلکہ ذہنی ٹارچر کا نشانہ بنایا گیا ہے اور یہ ذہنی ٹاچر جسمانی ٹارچر سے زیادہ خاطر ناک ہوتا ہے ظاہری زخموں کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہے اس کا علاج بھی کر سکتے ہے لیکن اندرونی زخموں کو نہ کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ ان زخموں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر سے اکرم کی ماں نے پوچھا لیکن میرا بیٹا:-

"لیکن یہ واحد کیس نہیں ہے ایسے ان گنت نوجوان ہمارے درمیان موجود ہے کچھ اندر سے زخمی ہے کچھ باہر سے"

"میرے دل میں وسوسے پیدا ہو رہے ہیں ڈاکٹر صاحب، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ایک سوچے سمجھے ارادے سے ہمارے نئی نسل کو ذہنی طور پر مفلوج کیا جارہا ہے۔[۷]

اس افسانے میں تخلیق کار نے انسانی بربریت اور مظالم کی تصویر کشی بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے انہوں نے اس کہانی میں ڈاکٹر کے کردار کو بھی بہترین انداز میں پیش کیا کیوں کہ وادی کشمیر میں ڈاکٹروں کے پاس ایئے دن اکرم جیسے ہزاروں نوجوان آتے ہیں جو سکورٹی فورسز کے تشدد کا شکار ہوتے ہیں اس کہانی میں افسانہ نگار نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وادی کشمیر میں نوجوانوں کو قید کے دوران فوج ان کو بجلی کے کرنٹ لگاتے ہیں ان کے سروں پر بجلی کی تاریں لگا کر جھٹکے دیتے ہیں اور باقدعدہ سوچی سمجھی پالیسی کے تحت کشمیر کی نئی نسل کو جیلوں میں ڈال کر ان کو ذہنی اور جسمانی طور مفلوج کر دیا جاتا ہے۔

کشمیر کے پرآشوب دور کے تعلق سے ڈاکٹر ریاض توحیدی نے بھی افسانے لکھے ہیں۔انھوں نے افسانہ لکھنے کا آغاز اس وقت کیا جب وادی کشمیر پُر آشوب دور سے گذر رہا تھا۔انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے اس کی فکر کی تربیت اُسی سماج اور ماحول میں ہوتی ہے یہی وجہ ہے فنکار اپنے فن میں سماج کی مثبت اور منفی دونوں طرح کی عکاسی کرتا ہے اسی مانند ڈاکٹر ریاض توحیدی کی فکری ارتقا کی تعمیر و تشکیل میں بھی ان کے ارد گرد کے ماحول اور معاشرے کا بڑا دخل رہا ہے یہی وجہ ہے انھوں نے وادی کشمیر کے درد کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔اس حوالے سے ان کے افسانے ،ناکہ بندی، جشن قبرستان، ٹوٹتی جوانیاں، ہوم لینڈ اور وطن کی عصمت قابل ذکر ہیں۔انھوں نے ان افسانوں میں وادی گلپوش کی ایسی سچائیوں کو پیش کیا ہے جس سے کشمیر اور کشمیریوں کی اصل اور درد بھری زندگی سامنے آتی ہے۔

"ناکہ بندی"

افسانہ "ناکہ بندی" میں ڈاکٹر ریاض نے جنت نظیر وادی میں ظلم و بربریت اور مظالم کی تصور کشی بڑی خوبصوت انداز میں پیش کی ہے انھوں نے اس کہانی میں ایک ایسی والدین کی حالت کو بیان کیا ہے جو اپنے بچے کو دودھ کا ایک بوند پلانا چاہتے ہے جس سے ان کی جان بچ جائے لیکن ان کو دودھ کی ایک بوند کے بجائے خون سے لت پت لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی ہیں اس افسانے کا مرکزی کردار بشیر ملک اور اس کی بیوی ساجدہ ہے ان کا چار مہینے کا بچہ دودھ کی ایک ایک بوند کے لیے ترس رہا تھا اور اس بچے کی کی چیخیں ماں باپ کے جگر کو پارہ پارہ کر رہیں تھیں لیکن دونوں اس قدر بے بس اور لاچار تھے۔ وہ گھر سے باہر جانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کو گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ باہر وار دی پوشوں نے کرفیو لگا کر ان کا دانہ پانی بند کر دیا تھا اور گھر میں کھانے پینے کی سبھی چیزیں ختم ہو گئی تھی اور ساجدہ کا یہ ننھا سا پھول بھوک سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ ساجدہ درد بھری لہجے میں کہتی ہے:

"بشیر، منا بے ہوش ہو گیا ہے۔ کہیں سے آٹو کا انتظام کرو اس کو اسپتال لے جانیگے۔،،

"اس اندھرے وحشت ناک رات میں ہم کس طرح گھر سے نکلیں گے۔ بیشر ملک نے انکھیں موندتے ہوئے کہا"

"باہر کرفیو لگا ہوا ہے صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔

پھر۔۔ صبح کو بھی کون اہسپتال جانے دیگا۔[۱۸]

کچھ دیر کے بعد مرکزی کردار بشیر اپنے گزرے دنوں کی یادوں میں کھو گیا اس سے یاد آرہا تھا کس طرح ہم کشمیری اپنی جنت میں آنے والے مہمانوں کا استقبال بڑے خوش اسلوبی سے کرتے آے تھے وہ سوچتے ہیں جب یہ لوگ کشمیر میں اپنی مذہبی مقامات پر زیارت کرنے آتے تھے کشمیری لوگ ان کو جگہ جگہ کھانے پینے کا انتظام رکھتے تھے لیکن ہمارے اسی انسانی سلوک کے بدلے آج یہی لوگ حیوانیت پر آتر آئے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس زہر آلودہ منصوبوں سے وادی میں نسل کشی کرنے کی قسم کھائی ہے یہی سوچتے سوچتے بیشر ملک کی آنکھ لگ جاتی ہے صبح سویرے کسی دوست نے بیشر ملک کو فون پر اطلاح دی کہ آج رضا کار تنظیم کی طرف سے انسانی حقوق کے دفتر کے سامنے ملک فوڈ بانٹا جائے گا ملک بشیر یہ سن کر تیز قدموں

سے نکلا اور وہاں پہنچ کر مشکلی سے دودھ کا ایک ڈبہ حاصل کر لیا ادھر بشیر ملک کی بیوی ساجدہ اپنے لخت جگر کو اہسپتال کی طرف چل پڑی ڈر اور خوف میں جب وہ سڑک پار کر رہی تھی کہ اچانک کہیں سے آواز آئی کرفیو میں کہاں جا رہی ہو؟

"ساجدہ نے خوف کے مارے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں آنسو بہاتے ہوئے کہا۔"

"بچہ بیمار۔۔اہسپتال۔۔!یہ سنتے ہی کئی وردی پوش سڑک پر نمودار ہو گئے۔"

"اچھا! بیمار بچے کو اہسپتال لے جانا ہے،،ایک وردی پوش بولا،

"اہسپتال جا کر کیا کرو گی وہاں تو دوائی نہیں ہے"

"چند لمحوں بعد کہیں سے ایک سنسانی ہوئی گولی آئی اور بچے کے پھول جیسے نازک بدن کو چیرتی ہوئی ماں کے دل میں پیوست ہو گئی"[19]

بشیر ملک جب دودھ کا ڈبہ لے کر گھر میں داخل ہوا تو وہاں اس کی نظر بیوی اور بچے کی لاش پر بڑی وہ حواس یافتہ ہو کر چیختے چلانے لگا مگر اس کی چیخ نیں بے معنی ثابت ہوئی کیوں کہ وردی پوشوں کی دہشت سے تمام لوگ گھروں کے اندر سہم گئے تھے اس کے بعد کرفیو میں آدھے گھنٹے کی ڈھیل دی گئی تمام لوگ گھروں سے باہر نکلے اور بازار کی طرف چل پڑے بشیر ملک بھی گھر سے باہر نکلا اور بازار کی طرف چل پڑا اس کے ہاتھ میں دودھ کا ڈبہ تھا چند لوگ سڑک پر جمع ہو گئے جب لوگوں نے اس کے ہاتھ میں دودھ کا ڈبہ دیکھا تو ایک آدمی ان کے سامنے آیا اور ملک بشیر سے پوچھنے لگا:

"اے بھائی! تمہیں یہ دودھ کا ڈبہ کہاں سے ملا؟ کیا اس سے بیچو گے؟

"بشیر ملک نے جب ہاں میں جواب دیا تو وہ آدمی حیران ہو کر بول پڑا،

"لیکن کیوں! تمہیں بھی تو اپنے بچے کے لیے اس کی ضرورت ہو گئی،،

"میرے بچے کو اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی وہ اب کفن کے انتظار میں ہے[20]

پچھلے کئی برسوں سے مظلوم کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا اندازہ اس افسانے "ناکہ بندی" کے مطالعے کے بعد بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس طرح افسانہ نگار نے بشیر اور ساجدہ کے کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کشمیر کے والدین اپنے بچوں کے لیے دودھ طلب کر رہے ہیں لیکن ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی ہے اور اگر کوئی ماں اپنے بیمار یا بھوک سے بلکتے بچے کی آواز پر گھر سے باہر نکلنے کی ہمت و جرت بھی کرتی ہے تو اس پر سیدھا گولیاں برسائی جا رہی ہیں۔ ظلم

وستم کی انتہا کہاں کہ ایک ماں کو اپنے بیمار بچے کو اہسپتال سے علاج کرانے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی۔اس کہانی میں ریاض توحدی نے ایک اہم حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ مظلوم کشمیری پچھلے پچیس برسوں سے اپنے ہی گھروں،اپنے وطن اور اپنی ہی جنت میں قیدیوں کی طرح زندگی بسر کر رہیں ہیں انہیں باہر نکلنے،اہسپتال سے علاج کرانے اور بچوں کو اسکول جانے تک کی بھی اجازت نہیں دی جاتی مظلوم کشمیری وردی پوشوں کے ظلم کی چکی میں مسلسل پس رہے ہیں۔یہاں تک کہ کرفیو کے باعث خولاک اور ادویات تک رسائی حاصل نہ ہونے کے سبب ہر طرف موت کے سائے منڈلا رہے ہیں یہ صرف بشیر کی کہانی نہیں ہیں بلکہ یہ وادی کشمیر کی گھر گھر کی کہانی ہے یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس سے پڑھ کر قاری اپنے آنسوں پر بڑی مشکل سے قابو رکھ پاتا ہے۔

"جشن قبرستان"

"جشن قبرستان" ڈاکٹر ریاض توحیدی کا ایک اہم افسانہ ہے۔یہ افسانہ بھی دہشت گردی کے نتیجے میں پھیلے ہوئے خوف سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے اس کہانی میں بھی افسانہ نگار نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ ہے کہ کس طرح قابض فوج کشمیری لوگوں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے ان کا مقصد صرف یہی ہے کہ نوجوانوں پر تشدد کر کے کشمیریوں کو اتنا زیادہ خوف زدہ کیا جائے کہ وہ ذہنی وجسمانی طور پر ہندوستان کا غلام بن جائے اور اس خوف کے باعث کشمیری عوام میں پھر مزاحمت یا بغاوت کے جذبات نہ ابھر سکیں یعنی بھارتی حکومت اور فوج نے کشمیریوں کو مطیع وفرمابردار بنانے کے لیے خوف کو خطرناک ہتھیار بنالیا ہے اس سارے منظر کی عکاسی ڈاکٹر ریاض توحیدی نے افسانے کے پہلے ہی اقتباس میں یوں بیان کیا ہے:

> "رات کے اندھرے میں اُٹھنے والی دہشت کی خوفناک آوازیں جب لوگوں کے دلوں پر اثرانداز ہو جاتیں تو پیر وجوان کی سوچوں پر وحشت کا سایہ چھاجاتا اور سوچ سمجھ کی قوت مفقود ہو جاتی ا۲

اس کہانی میں ڈاکٹر ریاض نے علامتی انداز میں ان حکمرانوں کا چہرہ بھی بے نقاب کیا ہے جنھوں نے اپنے اقتدار کے خاطر کشمیریوں کا سودا جابروں کے ساتھ کیا افسانے کا مرکزی کردار دادا جی اور چھوٹے چھوٹے بچے ہیں رات کے وقت جب دادا جی نے حقہ بھر دیا تو گھر کے سارے بچے اس کے سامنے کہانی سننے کے لیے بیٹھ گئے جب دادا جی نے سب بچوں کو کہا کون سی کہانی سننا پسند کروگے ؟سب بچوں نے کہا ہمیں جنوں اور پریوں کی کہانی نہیں سنی ہمیں اس بھیانک خوف ناک آوازوں کے بارے میں جاننا ہیں۔یہاں پر افسانہ نگار نے دادا جی کے کردار کے ذریعے وادی کشمیر کی تاریخ کو دادا جی کی زبان سے کہانی کی

صورت میں بچوں کو سنانا شروع کر دیا کہ وہ ایک پُر سکون وادی تھی اس وادی کی اپنی ایک شاندار تواریخ تھی اس کی اپنی ایک تہذیب اور تمدن تھا اور سب سے بڑھ کر جو دولت ان کے پاس تھی وہ تھا ان کا اپنا ایک آزاد ماحول۔ یہ ماحول بھائی چارے ،انسانی دوستی اور انسانیت کی روشنی سے چمکتا رہتا تھا۔ لیکن اب اس جنت کو دہشت گردوں نے جہنم زار بنا دیا۔ اس خوش حالی کو لوٹنے کے ارادے سے لالچی انسانوں نے کشمیر کو حاصل کرنے کے لیے کبھی لشکر کشی کر کے اور کبھی مکاری اور چال بازی کا جال بچھنا شروح کر دیا وادی کشمیر کے لوگوں نے کئی مرتبہ ان جابروں اور لالچی انسانوں کو شکست دینے میں کامیاب تو ہو گئے البتہ آج ان جابروں کی طاقت کے سامنے یہ کمزور انسان آخر کار ہار بیٹھے اور اس طرح وادی کشمیر کے خوش حال اور روشن دور پر بھیانک اندھروں کے کالے سائے چھا جانے لگے دادا جی نے یاسر کو حقے میں تمبا کو ڈالنے کے لیے کہا اتنے میں اندھرے کی خوف ناک آوازوں سے کان کے پردے پھٹنے لگے :

> تمام لوگوں سے کہا جا رہا تھا کہ وہ کل چھبیس جنوری کی صبح وادی کے قبرستان جمع ہو کر بادشاہِ وقت کے ساتھ جشن قبرستان منائے گے ۲۲؎

اعلان سُنتے ہ مرد، عورتیں، بچے بوڑھے اپنے اپنے مسائل لے کر بادشاہِ وقت کے سامنے آئیں کوئی اپنے بیٹے کے قاتل تو کوئی اپنی بیٹیوں کی عصمت دری کے بارے میں بادشاہِ وقت کے سامنے انصاف مانگنے آئے۔ جوں ہی کسی کی دل سے انصاف کی سرد آہ نکلتی ہے تو اس پر شاہی کوڑوں کی بارش کی جاتی تھی ان کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ شاہی قانون پر عمل کرتے ہوئے بادشاہِ وقت کے گلے میں پھول کی مالا ڈالے تو وہ لوگ ڈر اور خوف کی وجہ سے کسی نے بادشاہِ وقت پر کے گلے میں مالا ڈالا تو کسی نے آنسوں بابہاتے مٹھائیاں ڈالنے پر مجبور ہو گئے یہ وہ بادشاہِ وقت تھا جس نے ان کے بچوں کو حق خوداریت مانگنے کے جرم میں تشدد کر کے مار ڈالا تھا۔ جشن قبرستان ختم ہوتے ہی ہر طرف اندھرا پھلنا شروع ہوا اور خوفناک آوازوں سے لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اس افسانے میں وادی کشمیر کی تاریخ کو ایک خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے "جشن قبرستان" کو ہندوستان کی یومِ جمہوریہ کی علامت ہیں ہندوستان کے آزادی کے بعد ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء میں ہندوستان جمہوریہ ملک میں بدلا اور ملک میں آئین نافذ ہوا یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ہر سال ۲۶ جنوری کو یومِ جمہوریہ منایا جاتا ہے اس کہانی میں بادشاہِ وقت سے مراد شیخ عبداللہ ہیں جو تقسیم ہند کے بعد وادی کشمیر کا پہلا وزیر اعظم رہا شیخ عبداللہ نے کشمیری عوام کو ایک آزاد ملک کا سبز باغ دکھا کر لوگوں کو اپنے پیچھے لگائے رکھا اور اس موقع کا فائدہ اُٹھا کر ایک طویل عرصے تک وزیر اعظم بنا رہا اس کہانی میں افسانہ نگار نے شیخ عبداللہ کی سیاست کو بے نقاب کیا ہے اور اس حقیقت کی طرف آشارہ کیا ہے کہ شیخ

عبداللہ دوغلے پالیسی رکھنے والا شخص تھا اس کی ساری سیاست اپنے اقتدار کے لیے تھی جس کی وجہ سے انھوں نے وادی کشمیر کا سودا ہندوستان کے ساتھ کیا۔ اگرچہ ایک طرف افسانہ نگار نے جموں وکشمیر پر چھائی ہوئی دہشت، تنگ نظریہ، نفرت اور مکروفریب کی تاریکوں کی تصویر کشی کی تو دوسری طرف نئے سورج کے طلوع ہونے کا خواب بھی دکھایا ہے تاکہ جموں وکشمیر میں پھیلی ہوئی ادھرے کا خاتمہ ہوسکے اور اس زمین کے باسیوں کو عذاب کے دنوں اور وحشت کی راتوں سے نجات مل سکے۔ افسانے کے آخر میں ڈاکٹر ریاض توحیدی نے دادا جی کے کردار کے ذریعے پُر امید جملے بچوں کے گوش گذار کروائے ہیں دادا جی جب جشن قبرستان سے بچوں کے ساتھ گھر واپس آرہا تھا تو بچوں نے دادا جی سے پوچھا۔ دادا جی اس ظالم اندھیرے سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہے کہ نہیں تو دادا جی نے جواب دیا:

"ہاں میرے آنکھوں کے تارو۔۔۔۔اندھیرے کو بھگانے نے کا ایک ہی راستہ ہے کہ بستی کے گھر گھر سے روشنی کی مشعلیں جل اُٹھیں ہر انسان بیدار ہو جائے اور اپنے اندر پوشیدہ خوداری کے جذبے کو اُبھارے"[۲۳]

"ٹوٹتی جوانیاں"

افسانہ "ٹوٹتی جوانیاں" وادی کشمیر میں ہورہے ظلم وستم پر مبنی کہانی ہے اس افسانے میں بھی افسانہ نگار نے وادی کے ایک ایسے گاؤں کا حقیقی تاریخی واقعہ بیان کیا ہے جو بھارتی فوج کے ظلم وبربریت کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس سے پڑھ کر قاری حیران وششدر رہ جائے گا مگر حقیقت یہی ہے آج بھی وادی کشمیر میں بندوق کی نوک پر معصوم لوگوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھیں ڈاکٹر نے اپنا تعارف کرانے کے بعد تمام گاؤں والوں کا شکریہ ادا کیا دن گذرتے گئے ایک صبح ڈاکٹر بستر پر لیٹا ہو تھا کہ اچانک باہر سے ہر طرف چیخ وپکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ ڈاکٹر بستر سے اُٹھا اور اہسپتال کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا اہسپتال کے میدان میں تمام لوگ جمع تھے بہت ساری لڑکیوں کو رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ لڑکیاں پاگلوں کی طرح اپنے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کررہیں تھیں یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر ڈاکٹر بدحواس سا ہو گیا اور دوڑتے ہوئے ان لوگوں کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر نے طیش میں آکر ایک نوجوان کو تھپڑ مارتے ہوئے کہا یہ سب کیا ہے۔ اسکول ماسٹر جلدی سے سامنے آیا اور جوان عورتوں کی عصمت ریزی ہورہی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ڈاکٹر اور اور ماسٹر جی ہیں جب ڈاکٹر کی پوسٹنگ گلشن آباد کے پوشہ پورہ گاؤں کے سرکاری اہسپتال میں ہوئی تو گاؤں والوں نے پڑے دھوم دھام سے ڈاکٹر کا استقبال کیا تمام اور ڈاکٹر کو تیز لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے ان لڑکیوں کو بے ہوشی کا انجکشن لگادے ڈاکٹر دن بھر ان کا علاج کرتا رہا اور ماسٹر سے پوچھ بیٹھا یہ کیا ماجرا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ ماسٹر روتے روتے کہنے لگا یہ میری جوان بیٹی ہے اس کی عمر پنتیس برس ہے جن دوسری لڑکیوں کا علاج کرنے میں آپ دن بھر

مصروف رہے وہ چالیس لڑکیاں بھی تقریباً اسی عمر کی ہیں۔ڈاکٹر نے ماسٹر سے پوچھا؟لیکن آج ہی کے دن ان سب لڑکیوں کی حالت ایک ساتھ کیسے ہوئی؟ڈاکٹر کے پوچھنے پر ماسٹر کی بیٹی زور و قطار رونے لگی اور اپنے ہم عمر لڑکیوں کی دردیوں سنانے لگی:

"ڈاکٹر صاحب آج "آج یوم فتح" کی تاریخ ہے۔آج ہی کے دن ہمارا گلستان غیروں سے آزاد ہوا تھا ۔۔۔۔یوم فتح کی تقریب منانے کے سلسلے میں تمام گاؤں والے اہسپتال کے وسیع گراونڈ میں موجود تھے۔ گلستان کے پاسبان اسٹیج پر بیٹھے تھے۔۔۔۔اچانک زوردار زلزلہ آیا بہت سارے گاؤں والے اور کچھ پاسبان اس زلزلے میں مر گئے۔۔۔۔جو لوگ ابھی تک اسٹیج پر ہماری امن پرستی کی قسمیں کھا رہے تھے اچانک انہیں ہم سب سے بڑے امن دشمن نظر آنے لگے۔۔۔گلستان کے پاسبانوں نے سر عام لوٹ مار اور بربریت کا ننگا ناچ کھیلا اور نازک کلیوں کو ظالم کلچیں نے مسل کر رکھ دیا۔۲۴

اس افسانے میں افسانہ نگار نے دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب وادی کشمیر میں ۲۳فروری ۱۹۹۱ء کے درمیانی شب میں بھارتی فوج نے وادی گُلپوش کے ایک گاؤں میں سرچ آپریشن کے دوران مبینہ طور پر چالیس کشمیری خواتین کا گینگ ریپ کیا تھا۔پیش نظر افسانہ اسی بھیانک رات کی وہ داستان ہے جب وادی کا ایک گاؤں کنن پوش پورہ میں ۲۷ برس قبل بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں اجتماعی بے حرمتی کا نشانہ والی خواتین کی چیخیں آج تک خاموش نہیں ہوئی ہیں بلکہ اس سانحہ سے متاثر خواتین کے لیے آج بھی ۲۳فروری ۱۹۹۲ کا دن کسی ڈرانوئے خواب سے کم نہیں ان خواتین کو آج بھی جب ان لمحات کی یاد آتی ہے تو ان کے رونگٹے کھڑے اور خشک آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور پاگلوں کی طرح چلانے لگتی ہیں۔کنن پوش پورہ کے اس تاریخی واقع پر نعیمہ مہجور بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں شکار ہونے والی خواتین کے بارے میں یوں لکھتی ہیں:

کنن پوش پورہ میں بھارتی فوج نے تلاشی کی کاروائی کے دوران تقریباً ایک سو خواتین کی مبینہ اجتماعی آبرو ریزی کی ہے جس کے خلاف وادی کے طول و عرض میں شدید غم و غصہ اور احتجاجی مظاہرے دوبارہ شروع ہو گئے ہیں۔۲۵

خواجہ محمد بشیر بٹ کنن پوش پورہ کی خواتین کے ساتھ پیش آنے والے واقع کو یوں بیان کرتے ہیں:

۲۳فروری ۱۹۹۱ء کو ہندوستانی افواج کی ایک اہم رجمنٹ نے کنن پوش پورہ میں ۳۲ کم عمر جوان اور بوڑھی خواتین کی اجتماعی آبرو ریزی کی۔۲۶

افسانے کے آخر میں ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اس حقیقت کو بھی آجاگر کیا ہے وادی کشمیر کے کنن پوش پورہ گاؤں کے عورتیں آج تک شادی سے محروم ہیں۔ان میں کچھ خواتین جو جنسی زیادتی کی شکار ہوئی تھیں وہ آج بھی جسمانی طور پر معذور ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ عزت سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی ہیں:

> پچھلے بیس برسوں سے گاؤں میں کسی بھی لڑکی کی ڈولی نہیں اُٹھی کیوں کہ گلستان کے دلیر پاسبانوں نے ان کی عزت لوٹ کر جو سیاہ دھبے ان کے پاک دامن پر لگا دیئے۔زمانے کی گردش نے ابھی تک وہ صاف نہیں کیئے ۲۷

متذکرہ بالا تاریخی حوالوں سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہیں کہ بھارتی فوجیوں نے کنن پوش پورہ کی معصوم خواتین کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا۔رات کے گیارہ بجے اعلان کر کے مردوں کو عورتوں سے جدا کر کے عورتوں کو گھروں میں تن تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے اور گھروں کے اندر جا کر عورتوں کے ساتھ بے دردی سے ریپ کیا جاتا ہے کنن پاش پورہ واقعی تاریخ میں ایک تلخ یاد ہے جو کشمیر کی تاریخ میں کبھی مسخ نہیں ہو سکتی ہے۔

"ہوم لینڈ"

افسانہ "ہوم لینڈ" میں بھی ڈاکٹر ریاض توحیدی نے وادی کشمیر میں ۱۹۹۰ء کے بعد رونما ہونے والے حالات وواقعات کا ذکر کیا ہے۔اس کہانی میں افسانہ نگار نے وادی گُلپوش کے ماحول کی منظر کشی اس طرح کی ہے کہ قدرتی حسن وجمال کے ساتھ ساتھ وادی کشمیر کی تاریخ بھی اُمڈ کر آئی ہے۔وادی کشمیر نہ صرف حسن جمال سے پہچانا جاتا ہے بلکہ وہاں کے لوگوں کی اپنی تہذیب وتمدن بھی اپنا الگ اور منفرد مقام رکھتا ہے۔افسانہ نگار نے اس کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وادی کشمیر میں رہنے والے لوگ یعنی مسلم، ہندو، سکھ آپس میں اس طرح رہتے تھے کہ بعض جگہوں پر یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ کون کس مذہب سے تعلق رکھتا ہیں فرقہ ورانہ فسادات کا وہاں دور دور تک تصور نہیں ملتا تھا وہاں کے لوگ دوسرے مذہبوں کی لڑکیوں، ماں، بہنوں کی عزت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔افسانہ نگار یہ بتانے کی سعی کی ہے وادی کشمیر میں رہنے والے، ہندوؤں، سکھوں، اور مسلمانوں کے درمیان صدیوں سے چلے آرہے بھائی چارہ کو کیسے اور کن سازشوں کا شکار ہونا پڑا ہیں۔اس کہانی کی تین کردار ہیں، عبداللہ خان، سوم ناتھ، اور سردار سرجیت سنگھ یہ تینوں کردار تین الگ الگ فرقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔یہ تینوں بچپن کے دوست ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیار ومحبت سے رہتے تھے کشمیر میں جب کوئی مذہبی تہوار ہوتا تھا تو مشکل سے اندازہ لگانا پڑتا تھا کہ کون کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں کیوں کہ یہ

سب لوگ ہر تہوار کو اکٹھا مناتے تھے ایک دن سوم ناتھ نے صدیوں کے بھائی چارے کو یہ کہہ کر توڑ جب انھوں نے کہا کہ میں یہ وادی چھوڑ رہا ہوں عبداللہ خان اور سرجیت سنگھ یہ سن کر حیران و ششدر رہ گئے لیکن انھون نے محسوس کیا تھا کچھ سیاست دانوں نے صدیوں کے اس بھائی چارگی کو ختم کرنا شروع کر دیا ہے۔ عبداللہ خان نے سوم ناتھ کو غصے میں آکر پوچھا:-

"سوم ناتھ! آپ کیوں اس صدیوں کے بھائی چارے کو توڑنا چاہتے ہو؟ تم ہمیں چھوڑ کر مت جا"

"نہیں عبداللہ بھائی" سوم ناتھ نے درد بھری آواز میں کہا،، ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنوں سے سندیش ملا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے تم وادی چھوڑ کر چلے آو۔ ۲۸

اس اقتباس میں تخلیق کار نے ایک اہم مسلئے کو اُجاگر کیا ہے ۱۹۹۰ء میں وادی میں ہر طرف خوف و دہشت کا ماحول چھایا ہوا تھا چنانچہ وقتاً فوقتاً اس معاملے کو لے کر وادی میں آوازیں بلند ہونے لگی جب لاکھوں کشمیریوں نوجوانوں نے بھارت کے خلاف سینہ سپیر ہو کر کشمیر کے آزادی کے لیے جانیں قربان کر دی تو اس وقت گورنر جگمو ہن نے سازش کر کے کشمیری پنڈتوں کو گھر گھر یہ بات پہنچادی کہ وہ فوری طور پر وادی کو چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ چلے جائیں۔

وقت گزرتا گیا ایک دن عبداللہ خان کے نام پر ان کے دوست سوم ناتھ کی چھٹی آئی سوم نے عبداللہ خان کو لکھا تھا:

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو میں نے دوسروں کے بہکاوئے میں آکر اپنے آپ کو مصیبت کے بھنور میں جھونک دیا۔ وہاں آپ لوگ ہماری بہو، بیٹیوں کی عزت بھی کرتے تھے اور حفاظت بھی! لیکن یہاں جنہیں ہم اپنا سمجھتے رہے وہ ہماری بہو، بیٹوں کی طرف ہوس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اور ہمیں مائیگریٹ کہہ کر ہر مقام پر ذلیل کرتے ہیں۔ ۲۹

سوم ناتھ نے اپنے دوست عبداللہ خان کو یہ بھی لکھا تھا اگر اپ میرے گھر کو جلاڈالو گے تو میں انشورنس کمپنی سے اس کا معاوضہ وصول کر سکھوں اور میری جو زمین ہے اس کو بھی بیچ ڈالو کیوں کہ میرے بیٹے پر تھوی کو آرمی کا رُتبہ ملا ہے جس کے لیے ان کو ٹریننگ پر جانا ہے اس لیے مجھے پیسوں کی بہت ضرورت ہے۔ عبداللہ خان نے اپنے بیٹے غزنوی سے مشورہ کیا کہ سوم ناتھ کا مکان ہم کیسے جلاڈالے گے اگر وہ کبھی واپس آیا تو وہ کہاں رہیں گے لہذا میرے پاس کچھ پیسے ہیں اور کچھ اس کی زمین بیچے گے کچھ دنوں کے بعد انھوں نے سوم ناتھ کو پیسے بھیجے ایک مہنے کے بعد سوم ناتھ نے عبداللہ خان کو پارسل بھیجا جس میں زمین کے کاغذات کے ساتھ ایک چھٹی بھی ملی جس پر لکھا تھا:

"ہم لوگ آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے پر تھوی نے نوکری جوائین کر لی ہے، یہ سب آپ کا مخلصانہ مدد سے ہوا۔ ۳۰

کچھ برس گذرنے کے بعد ایک دن لوگ صبح سویرے جب نید سے جاگ رہے تھے تو فوج نے سارے علاقے کو گھیر لیا تھا تمام لوگوں کو اپنے گھروں سے نکل کر ایک جگہ جمع کیا گیا جب فوجی آفیسر لوگوں کے سامنے کھڑا ہو گیا لوگ خوش بھی تھے اور حیران بھی کیوں کہ یہ سوم ناتھ کا بیٹا پر تھوی تھا جو لوگوں پر الزام دے رہا تھا تم لوگوں کی وجہ سے پچھلے بیس برسوں سے جن حالات سے ہم گذر رہے ہیں اس کے ذمہ دار صرف تم لوگ ہو۔ تم لوگوں نے ہماری زمینوں پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ تم لوگوں نے ہمارے گھر جلائے ہے اور تم لوگوں نے ہمیں اپنے گھروں سے بے گھر کیا لوگ پر تھوی کے باتیں سن کر آگ بگولہ ہو گئے ہر طرف ظلم کے خلاف نعرے بلند ہو گئے عبداللہ خان کا بیٹا غزنوی کھڑا ہو گیا اور تلخ لہجے میں پر تھوی کو کہنے لگا:

"تم لوگ اپنی جنم بھومی کو دھوکہ دے کر اور صدیوں کے بھائی چارے کو توڑ کر یہاں سے فرار ہوئے ہو ، تم لوگوں نے خود اپنے مکان جلوائے اور اپنی زمین ہمیں بیچ ڈالیں تم لوگوں نے اس پوتر دھرتی کو تیاگ دیا۔ ۳۱

اس افسانے میں افسانہ نگار نے نہایت ہنرمندی سے کئی حقیقتوں کو سامنے لانے کی کوشش ہے کہ کشمیریوں نے کبھی اقلیت کو اقلیت نہیں سمجھا بلکہ ان لوگوں کو ہمیشہ کشمیریوں نے اپنے عذیزوں اور پیاروں سے بڑکر محبت دی مگر جب بھی کشمیری لوگوں پر کوئی مصیبت آن پڑی اُس وقت اقلیت اکثریت کے ہم قدم نہیں تھیں بلکہ انھوں نے اپنی جان بچانے کے لیے صدیوں کے بھائی چارے کو ختم کر دیا اور اپنی زمین جائداد کا سودا خود کر کے کشمیریوں پر الزام لگا دیا کہ آپ لوگوں نے ہمیں گھر سے بے گھر کیا حالانکہ اگر اس افسانے کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ کہانی حقیقت کے بہت قریب ہے اس کہانی میں اقلیت پر بہت گہرہ طنز پوشیدہ ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنی مادر وطن کھو دیا بلکہ کشمیری مسلمانوں کا پیار، محبت ،اور بھائی چارہ بھی کھو دیا انھوں نے وادی کی آزادی کی جدوجہد میں الگ رہ کر اچھا نہیں کیا۔

"وطن کی عصمت"

افسانہ "وطن کی عصمت" ڈاکٹر ریاض توحیدی کا افسانوی مجموعہ "کالے دیوؤں کا سایہ" کا بہترین افسانہ ہیں اس کہانی میں افسانہ نگار نے ایک گھر کے خواتین کا سچا واقعہ بیان کیا ہے۔ جو ہندوستانی فوج کے بدترین جنسی تشدد کا شکار ہوئے ہیں یہ قصّہ ایک ایسی سچی وردات پر مبنی ہے جس سے پڑھ کر قاری کی روح کانپ اُٹھاتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار آسیہ اور

نیلوفر ہیں یہ افسانہ حقیقی ناموں کے ساتھ لکھا گیا ہیں آسیہ کالج کی طالبہ تھی اور نیلوفر اس کی بھابی اور دو سال کی بچے کی ماں تھی آسیہ اور نیلوفر دونوں ایک ہی گھر سے تعلق رکھتی تھیں وردی پوشوں نے ان دونوں کے ساتھ بے حرمتی کرنے کے بعد بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ اس میں افسانہ نگار نے ایک اہم حقیقت بیان کی ہے کہ آسیہ اور نیلوفر کا واقعہ ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ کا بدترین سانحہ ہے اور اس واقعے نے پورے ہندوستان کے ماتھے پر بدنما داغ لگا دیا ہے۔ آسیہ اور نیلوفر گاؤں سے دور اپنے باغیچے کی طرف کسی کام سے گئی ہوئی تھیں وہ دونوں جب وہاں سے گھر کی طرف نکل پڑے تو راستے میں انھوں نے فوجیوں کی گاڑی دیکھی چند ہی لمحوں میں ہندوستان کے قابض فوج نے دونوں کو اغوا کر کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا آسیہ اور نیلوفر یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر سہم گئیں دونوں خون کے آنسوؤں بہا رہی تھیں ایک گھنٹے کے بعد جب وردی پوش اس کمرے میں داخل ہو گئے تو دونوں ان کی دہشت دیکھ کر ان سے اپنی رہائی کے لیے گڑگڑا کر بیک مانگتے رہے لیکن وہ درندے ان معصوم لڑکیوں پر حیوانوں کی طرح جھپٹ پڑے یہ سلسلہ رات بھر چلتا رہا:

> "وہ چیخ رہیں تھیں لیکن وحشی درندوں کی پیاس نہیں بجھتی تھی وہ بے ہوش ہو گئیں اور رات بھر ظلم کا شکار ہوتی رہیں۔ یہ رات اُن کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی۔ ۳۲

شبنم قیوم اپنی کتاب "یہ لہو کشمیر کا ہے، یہ کشمیر مرا!" میں اس تاریخی واقع پر یوں لکھتے ہیں:

> ۳۰ مئی کے روز شوپیان کی آسیہ اور نیلوفر نامی ایک ہی گھرانے کے دو لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کی آبرو ریزی کے بعد قتل کیا گیا۔۔۔ علاقہ میں یہ خبر جب جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تو علاقہ شوپیان ۔۔۔ میں غم والم کی ایک لہر دوڑ گئی یہ غم اور والم احتجاجی مظاہروں میں بدل گیا۔ ۳۳

آسیہ اور نیلوفر کو جنسی زیادتی کے بعد قتل کی چیخ تمام وادی میں جب پھیل گئی تو ساری وادی احتجاج بن گئی وادی کے حکمران نے س سانحہ کو ایک حادثہ قرار دیا لیکن احتجاج کی آگ جب پھلتی گئی تو انھوں نے جو لب کشائی اس سانحہ پر کی تھی وہ انہیں مہنگی پڑی۔ چنانچہ لوگوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنا بیان واپس لے کر انھوں نے اس کیس کی تحقیقات کرانے کا اعلان کیا۔ سرکار نے یہ یقین دہائی کرائی کہ مجرموں کو پکڑ کر انہیں عبرتناک سزدی جائے گئی لیکن بیالیس دنوں کے بعد ایک ایسی رپورٹ سامنے آئی جس نے اس سانحہ کی جان ہی نکال دی:

> "مجرموں کو عوام کے سامنے بے نقاب کر کے بجائے قتل کی گئی دونوں لڑکیوں کے کردار کو داغدار بنانے اور انصاف کے طالب ان کے گھر والوں کو اس قتل کے ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی گئی۔ ۳۴

شبنم قیوم مزید لکھتے ہیں:

C.B.I کی رپورٹ آنے کے بعد اس تحریک کو طاقت کے زور پر دبایا گیا۔ ۳۵

افسانہ نگار نے اس کہانی میں قوم کے ان حکمرانوں کا چہرہ بے نقاب کیا ہیں جنھوں نے اپنے اقتدار کے خاطر بھارتی فوج کو کشمیری عوام پر ظلم و جبر کرنے اور خواتین کی بے حرمتی کرنے کی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے جس طرح آسیہ اور نیلوفر کو جنسی تشدد کر کے بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا ایسی سینکڑوں مثالیں وادی کشمیر میں موجود ہیں جس سے ظاہر ہوتا کہ کس طرح بھارتی فوج خواتین کی عصمت دری کو جنگ کے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ وادی گُلپوش میں ہزاروں خواتین ایسی ہیں جنہیں آج تک انصاف نہیں ملا انہیں طاقت کے بل پر ڈرایا دھمکایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی ہونٹ سی لیتے ہیں وہ اپنا غم ظاہر کرنے کے بجائے خاموش رہ کر زہر کے تلخ گھونٹ پیتے رہے ہیں۔ وادی کشمیر میں کئی جگہوں پر خواتین اپنی زندگیوں سے کھیل کر بھارتی فوجیوں جوانوں کے چنگل میں پھسنے کے بجائے موت کو ترجیحی دے رہے ہیں اس میں افسانہ نگار نے اس بات کی طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ کس طرح حکمران اور فوج مل کر کشمیری بے گناہ لوگوں کا لوٹ مار اور قتلِ عام کر کے الٹا ان پر ہی جھوٹے کیس دائر کر رہی ہیں جو کہ انتہائی شرم ناک ہے۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اس کہانی میں نہ صرف وادی کشمیر کی خواتین کی آبر ریزی کی ترجمانی کی ہیں بلکہ کشمیری عوام کو جزبہ حریت کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے جس سے پڑ کر قاری انقلابی فکر سے آشنا ہو جاتے ہیں:

"کب تک اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت کو تار تار ہوتے ہوئے دیکھو گے۔۔ اُٹھو، اپنی آواز اُٹھاؤ ۔۔ ان ظالموں کے خلاف، ان جابروں کے خلاف اور اپنے وطن کی عصمت۔۔ اپنی وادی کی عصمت کو بچاؤ۔ ۳۶۔

ریاست جموں و کشمیر پچھلے پچیس برسوں سے جو مذاحمتی ادب (افسانے) تخلیق ہوا ہے اس کے مطالعے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ نویں کے دہائی میں جب حالات زیادہ ہی بگڑ گئے اور کشمیر کے حسین مناظر خون آشام ماحول کے لپیٹ میں آ گئے تو وادی کی قتل و غارت گری اور ظلم و بربریت نے وہاں کے ادیبوں کی فکر و سوچ کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ اس طرح سے اب ان کے تخلیقات میں رومانوی منظر نگاری کے بجائے خون خرابہ، ظلم و تشدد، کریک ڈاون جیسے موضوعات اور کہانیوں نظر آنے لگیں۔ چونکہ ان ادیبوں نے خود ان حالات کو جیا اور ستم رسیدہ حالات و واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جن میں شبنم قیوم، نور شاہ اور ریاض توحیدی کے نام خاص پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے قلم سے سیاہی کے بدلے خون ٹپکتا نظر آ رہا

ہے اس کی ایک اہم وجہ وادی کشمیر میں ہندوستان کی جارحیت، تہذیبی منافرت، مذہبی تعصب اور سیاسی و فوجی یلغار ہے ۔پہلے جو افسانہ نگار فکری طور پر پُر سکون انداز سے سوچتے تھے اب ان کے فکر و سوچ کا زاویہ ہی بدل گیا۔ان کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کشمیریوں کے جذبات واحساسات کی کھل کر ترجمانی کی ہے اور ہو بھی رہی ہیں ۔ان کے کہانیوں میں کشمیر کا درد و کرب گولیوں اور دھماکوں کی گن گرج، گمشدہ افراد، دہشت، تنگ نظریہ، نفرت یہ سب مسائل ریاست کے مسلم افسانہ نگاروں کے لکھے جانے والے افسانوں میں پڑھتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔یہ افسانہ نگار سماجی ،معاشی، عدم مساوات کے خلاف اپنی آواز بلند کر رہے ہے۔وہ سیاسی بے رہ روی اور رجعت پسندانہ رویوں کے خلاف اپنی تحریروں کے ذریعے ایک اَن دیکھی لڑائی لڑ رہے ہے، بھائی چارے، اخوت اور مذہبی رواداری کی عظمت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔وہ وادی کے حالات وواقعات کی عکاسی کر کے دنیا تک اس کی اصل حصقیقت پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں جو کافی حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب نظر آرہے ہیں۔ان افسانہ نگاروں نے نہ صرف جموں و کشمیر پر چھائی ہوئی دہشت گردی ، ظلم و بربریت، اور مکر و فریب کی تاریکوں کی تصویر کشی ہی نہیں کی ہے بلکہ انھوں نے جموں و کشمیر کے عوام ایک نئے سورج کے طلوع ہونے کا خواب بھی دیکھا یا ہے تا کہ جموں و کشمیر میں پھیلی ہوئی اندھرے کا خاتمہ ہو سکے اور اُس زمین کے باسیوں کو عذاب کے دنوں اور وحشت کی راتوں سے نجات مل سکے۔

حوالہ جات

۱۔ شبنم قیوم، آزادی کی تلاش (افسانوں کا مجموعہ)، (سرینگر: وقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۷۰۔

۲۔ ایضاً، ص ۷۲۔

۳۔ ایضاً، ص ۷۴۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۲۱۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۱۶۔

۷۔ ایضاً، ص ۱۱۶۔

۸۔ نور شاہ، کشمیر کہانی، (سرینگر: میزان پبلشرز، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۰۔

۹۔ ایضاً، ص ۲۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۴۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۸۵۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۸۶۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۱۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۹۱۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۲۔

۱۸۔ ریاض توحیدی، کالے پیڑوں کا جنگل (افسانوں کا مجموعہ)، (سرینگر: میزان پبلشرز، ۲۰۱۱ء)، ص ۳۹۔۴۰۔

۱۹۔ایضاً،ص۴۱۔

۲۰۔ایضاً،ص۴۲۔۴۳۔

۲۱۔ایضاً،ص۴۴۔

۲۲۔ایضاً،ص۴۶۔

۲۳۔ایضاً،ص۴۸۔

۲۴۔ایضاً،ص۵۵۔

۲۵۔نعیمہ احمد مہجور،دہشت زادی(سرینگر:میزان پبلشرز،۲۰۱۲ء)ص۱۹۰۔

۲۶۔خواجہ محمد بشیر بٹ،جموں کشمیر کی درد ناک تصویر(لاہور:حنیف پرنٹرز،۲۰۱۶ء)ص۳۵۱۔

۲۷۔ایضاً،ص۵۶۔

۲۸۔ایضاً،ص۷۶۔

۲۹۔ایضاً،ص۷۸۔

۳۰۔ایضاً،۷۹۔

۳۱۔۔ایضاً،ص۸۰۔

۳۲۔ریاض توحیدی،کالے دیوؤں کا سایہ(افسانوں کا مجموعہ)،(سرینگر:میزان پبلشرز،۲۰۱۴ء)ص۱۰۹۔

۳۳۔شبنم قیوم،یہ لہو کشمیر کا ہے یہ کشمیر مرا(دہلی:بھارت پرنٹرس،۲۰۱۶ء)ص۲۹۶۔۳۴۔

۳۴۔ریاض توحیدی،کالے دیوؤں کا سایہ،ص۱۱۰۔

۳۵۔شبنم قیوم،یہ لہو کشمیر کا یہ کشمیر مرا،ص۲۹۹۔

۳۶۔ریاض توحیدی،کالے دیوؤں کا سایہ،ص۱۱۰۔

باب سوم:

غیر مسلم افسانہ نگاروں کے افسانوں میں ریاست جموں و کشمیر کے حوالے سے فکری و نظری مباحث کا مطالعہ

جس طرح ہم نے پچھلے باب میں کشمیر کے موضوع پر لکھے جانے والے معاصر مسلم افسانہ افسانہ نگاروں کے افسانوں کا فکری و نظری مباحث کا جائزہ لیا ہے اسی طرح اس باب میں کشمیر پر لکھے جانے والے غیر مسلم افسانہ نگاروں کے افسانوں کا فکری و نظری مباحث کا جائزہ لیا جائے گا اور اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے گی کہ انھوں نے وادی کشمیر کے پُر آشوب دور کو اپنے افسانوں میں کس طرح بیان کیا ہیں اور وادی کشمیر میں پیش آنے والے حالات وواقعات پر ان کی فکر و نظریہ کیا تھا اور اُن حساس قلکاروں کو سامنے رکھتے اس بات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی کہ انھوں نے اپنی فکر و سوچ سے کشمیر کی بدلتی ہوئی صورت حال کو کس طرح اپنے افسانوں میں بیان کیا ہیں۔

وادی کشمیر کے غیر مسلم طبقہ ابتداء ہی سے علم وادب سے وابستہ رہے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کی ابتداء بھی غیر مسلم افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی کے ہاتھوں ہی ہوئی نوی کی دہائی میں جب وادی کشمیر دہشت گردی کا شکار ہوئی جیسا کہ پچھلے باب میں ہم نے اس کا ذکر کیا ہیں کہ وادی کشمیر کی تحریک آزادی میں عسکریت داخل ہو گئی جس سے وادی میں ایک نئی جنگ چھیڑ گئی جس سے وادی میں رہنے والا ہر طبقہ متاثر ہوا تو کشمیر کی ہندوؤں پنڈت طبقے کو ایک منصوبہ پلان کے تحت سرکار نے جموں اور دہلی منتقل کر دیا اس تناظر میں کشمیر کی اقلیتی برادری ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئی جس کے زخم ابھی تک ہرے ہی رہیں کیوں کہ ان کے لیے اپنا وطن چھوڑنا کسی اذیت ناک حادثے سے کم نہیں تھا اور پھر راتوں رات ٹرکوں میں سوار ہو کر اپنے آباؤ واجداد کی چھوڑی ہوئی ورثہ ان کے لیے چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ انہیں وادی کشمیر کی رواداری اور بھائی چارے کا متبادل ہندوستان کی کسی کونے میں میسر نہیں ہوا وہاں بھی انہیں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا خاص طور پر ہندوستان ان کے لیے ایک اجنبی وطن جہاں کی تہذیب و تمدن وادی کشمیر کی تہذیب و تمدن سے بالکل مختلف ہے جموں میں بھی انہیں ڈگرہ ہندوؤں سے کافی اذیتں جھلنی پڑیں جو افسانہ نگار وادی کشمیر کے پُر آشوب دور سے گذر کر اپنے تہذیب و تمدن اور ثقافت کو ایک جانب چھوڑ کر اپنے آبائی وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے ان کے افسانوں میں اپنے دیش اور دھرتی سے جدائی اور ہجرت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں دیپک

کنول، دیپک بد کی اور یندر بٹواریو غیرہ نے کشمیری پنڈتوں کی دربدری اور بے گھری پر افسانے تحریر کئے ہیں ان کا ہر افسانہ چیخ چیخ کر ریاست جموں و کشمیر کی بربادی کی تاریخ بیان کر رہا ہیں۔

دیپک کنول ریاست جموں و کشمیر کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں ان کے کہانیوں میں ان کی ذہنی و فکری پختگی کا احساس ہوتا ہے ان کی اکثر کہانیوں کشمیر کے پُر آشوب دور سے تعلق رکھتی ہیں جس نے ہر کشمیری کو اندر سے توڑ بھوڑ کر کے رکھا ہیں ۔انھوں نے زیادہ تر کشمیری پنڈتوں کی دربدری اور بے گھری پر افسانے لکھے ہیں ان کا افسانی مجموعہ "برف کی آگ" کے بیشتر افسانے وادی کشمیر کے مسائل کو بیان کرتی ہیں۔ جن میں تفتیش، بولنا منع ہے، شعلے، نند بابا اور مخبر وغیرہ خاص قابل ذکر ہیں۔

"تفتیش"

دیپک کنول کا افسانہ "تفتیش" وادی کشمیر کے نامساعد حالات سے تعلق رکھتا ہے اس میں افسانہ نگار نے ایک ایسے گھر کی کہانی بیان کی ہیں جو کشمیر کی اسی اندوہ ناک صورت حال کے شکار ہوئے ہیں افسانے کا مرکزی کردار شہباز اور بلقیس ہیں۔ یہ دونوں پہاڑی اور گوجر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں دنیا و فہمیا سے بے خبر اپنی سادہ زندگی گذارتے تھے لیکن وادی کشمیر کی جو اندوہ ناک ہوا چلی وہ دور دور تک پھیل گئی تو شہباز اور بلقیس بھی ان حالات کے شکار ہوئے۔ بلقیس اُس وقت حیران ہو جاتی ہے جب رات کے وقت اچانک دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی تو بلقیس کے ذہن میں خوف کے مارے طرح طرح کے سولات اُٹھ رہیں تھے اتنے میں دستک توڑ پھوڑ میں تبدیل ہو گئی بلقیس نے گھبرا کر شہباز کو دھمی آواز میں جگا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ شہباز نے جب دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا تو سامنے تین ہیبت ناک شکلیں سامنے کھڑے تھے شہباز ان سے کچھ پوچھتے تو تینوں نے اس سے ہٹا کر کمرے کے اندر گھس آئے تینوں ہتھیاروں سے لیس پوری طرح تھے۔ شہباز ہکا بکا ہو کر تینوں کو گھورنے لگا ان کے چہروں پر لمبی گھنی داڑھیاں اور لمبے لمبے بال تھے:

> ہمیں نہیں پہنچانتے ہو۔ ہم تمہارے دینی بھائی ہیں سرحد پار کر کے تم لوگوں کو کافروں کے چنگل سے آزاد کرانے آئے ہیں۔[1]

سرحد پار کے یہ تینوں جوان شہباز کے گھر میں پناہ لیتے ہے رات کا کھانا کھا کر شہباز اور بلقیس کو الزام لگاتے ہے کہ ہمیں خبر ملی ہیں تم فوج کی مخبری کرتے ہو۔ شہباز گڑگڑا کر ان سے فریاد کرتا ہے ہم کسی فوجی کو جانتے تک نہیں مخبری کس سے کریں سچ اور جھوٹ کیا ہے ؟ یہ تفتیش کے بعد پتہ چلے گا اس کے بعد سرحد پار کے ایک جوان نے شہباز کو کہا تم ادہر ہی

بیٹھو تمہاری تفتیش ادھر ہی ہو گئی اور ایک جوان نے بلقیس کو تفتیش کے لیے دوسرے کمرے میں لے گیا اسی طرح تینوں جوانوں نے باری باری رات بھر ملقیس کی آبرو لوٹتے ہیں۔ شہباز صبح جب ان تینوں جوانوں کو بستی سے باہر چھوڑ کر خوشی خوشی گھر کی طرف بڑھنے لگا جب وہ گھر پہنچا تو بلقیس کی حالت غیر دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا:

> ان تین بھیڑیوں نے تفتیش کی آڑ میں اس سے نوچ ڈالا تھا۔ اس سے لہولہان کر دیا تھا اس کی عزت وعصمت کی دھجیاں اُڑائی تھی اپنی بھوک مٹانے کے لیے انھوں نے اس کا حال بد کر دیا تھا۔[۲]

اس افسانے کا مطالعہ کے بعد اندازہ ہو رہا ہے کہ افسانہ نگار نے غیر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کر کے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا ہے کہ سرحد پار سے جو دہشت گرد آتے ہیں وہ کشمیری لوگوں کے مدد کرنے کے بجائے وہ وہاں کے معصوم عورتوں کو اپنی جنسی حوس کو پورا کرنے کے لیے آتے ہیں اور پھر اپنی ناجائز حرکات کو جہاد کا نام دیتے ہے حالانکہ اگر دیکھا جائے تو حقیقت اس کے برعکس ہے اگر اس افسانے کا موازنہ ڈاکٹر ریاض توحیدی کا افسانہ "وطن کی عصمت" سے کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ انڈین فوج وادی کشمیر میں عصمت دری کو جنگی حربے کے طور پر استعمال کر رہی ہیں۔ بھارتی فوج وادی کشمیر میں آزادی کی جدوجہد کو دبانے کے لیے خواتین کو نشانہ بنا رہی ہیں حالانکہ پوری دنیا جانتی ہیں کہ بھارتی فوج نے آج تک وادی کشمیر کے ہزاروں عورتوں کو اپنی حوس کا نشانہ بنایا ہے جس پر کئی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہے جن میں **"کشمیر میں عورتوں کی بے حرمتی"** "do you remember Kunan Poshpora?" اس کے باوجود بھی افسانہ نگار نے سچائی سے مُنہ موڑ کر پروپیگنڈہ کر کے مسلمانوں کو بدنام کر رہیں ہیں۔

"نند بابا"

افسانہ "نند بابا" کا موضوع ہجرت کشمیر ہے افسانہ نگار خود ایک مہاجر ہے جو نوئی کی دہائی میں وادی کشمیر کو چھوڑ کر ممبئی ہجرت کرنے پر مجبور ہوا۔ افسانے کا مرکزی کردار نند بابا اور اس کا بھائی تیج کشن ہیں۔ نند بابا ذہنی طور پر معذور ہوتا ہے ان کی ماں جب زندہ تھی وہ نند سے بہت محبت کرتی تھی اس سے نہلا دھلا کر اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھی لیکن جب نند کی پرورش کی زمہ داری ان کے بھائی تیج کشن اور اس کی بھابی لتا پر پڑتی ہیں تو تیج کشن بھی اپنے بھائی نند بابا کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا ہے اسی دوران وادی میں ہر طرف افراتفری دہشت خوف وہراس پھیل گیا انسانی خون پانی کی طرح بہنے لگا لوگ بے گھر اور بے وطن ہو گئے اس دہشت سے کچھ لوگ اپنی جان بچانے کے خاطر وادی کشمیر سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے افسانے کا مرکزی کردار نند کا بھائی تیج کشن بھی زیادہ دیر اس خوف اور دہشت میں جینے کے لیے تیار نہ تھا اس نے بھی اپنا

وطن چھوڑنے کا فصیلہ کر لیا وہ اپنے بھائی نند بابا کو بھی اپنے ساتھ جموں لے جانا چاہتا تھا مگر اس کی بیوی لتا اس فصیلے کے حق میں نہیں تھی وہ یہ سوچتی تھی اگر نند وہاں اجنبی شہر میں کئی سے نکل گیا تو ہم اس انجان شہر میں کیسے ڈھونڈے گے۔ایک دن تیج کشن اور لتا دونوں نند بابا کو نید میں چھوڑ کر گھر سے بھاگ گئے:

> اگلی صبح جب نند کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ گھر سنسان اور خاموش پڑا تھا اس نے بھائی بھابی کو ڈھونڈا مگر وہ کہاں ملنے والے تھے وہ تو اس کے پہونچ سے بہت دور چلے گئے تھے۔[۳]

مندرجہ بلا اقتباس سے ظاہر ہو رہا ہے جب انسان کو اپنی جان کی پڑتی ہے تو وہ ساری انسانی اور اخلاقی قدرے بھول جاتا ہے افسانہ نگار نے نند کے کردار کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وادی کشمیر کے حالات وواقعات نے لوگوں کو اتنا بے رحم بنا دیا کہ بھائی بھائی سے دھوکا کر رہا ہیں۔انسان انسان کا خون بہا رہا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار نند جب صبح نید سے بیدار ہوتا ہے وہ پگلوں کی طرح اپنے بھائی اور بھابی کو تلاش کرتے کرتے دوسرے گاؤں میں پہنچ جاتا ہے نند ایک گھر کے باہر رو رہا تھا اچانک اس گاؤں کے ایک نیک اور شریف بزرگ میر صاحب نے نند کو روتے ہوئے دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہوا وہ سوچنے لگا اگر نند کو بھائی نے یہاں مرنے کے لیے چھوڑ دیا تو کیا ہوا یہ تو اللہ کا بندہ ہے نند پہلے اپنے بھائی کے دل میں رہتا تھا اب میر صاحب کے دل میں رہنے لگا۔میر صاحب نے ان کو اتنا پیار دیا کہ وہ اپنے بھائی کو بھول گیا۔میر صاحب اور نند کے پیار و محبت کا یہ عالم تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہتے تھے افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وادی کشمیر میں فرقہ وارانہ فسادات کا دور دور تک تصّور نہیں ملتا تھا لیکن اب کہانی میں ایک اور پہلو سامنے آتا ہے کہ کل تک ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے پیار و محبت اور ان کی حفاظت کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے لیکن اب اس پیار و محبت کے بیچ نفرت کا بیج سرحد پار کے ہوا نے اتنا ڈالا اب مسلمان اور ہندؤ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے:

> وادی میں سرحد پار کے زہریلے پروپیگنڈے کا اتنا شدید اثر ہوا تھا کہ جو کل تک ہندو کو اپنا بھائی کہتے تھے وہ اب انہیں اپنا دشمن سمجھنے لگے تھے۔انسانیت اور انسانی قدریں اور اور باہمی پیار و محبت دین و دھرم کے خانوں میں بٹ گیا کئی کٹر لوگوں کو ایک ہندو اور مسلمان کی اتنی زیادہ قربت اور اتنا شدید پیار ایک آنکھ نہ بھایا۔[۴]

اس افسانے کو پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے جانبداری کا مظاہرہ کر کے حقیت سے مُنہ موڑ کر سرحد پار پر الزام دے کر اپنی دل کی بھڑاس نکال دی۔افسانہ نگار لوگوں کو یہ باور کرانا چاہ رہے ہیں کہ سرحد پار کے

لوگوں نے اپنے مفاد کے خاطر وادی کشمیر میں صدیوں سے مل جل کر رہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیچ نفرت کا جزبہ پیدا کیااور سرحد پار کے پروپیگنڈے نے فرقہ وارانہ فسادات سے وادی کشمیر میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے حلانکہ اگر اس افسانے کو وادی کشمیر کی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو حقیقت اس کے برعکس ہیں ۔شبنم قیوم اپنی کتاب (کشمیر میں عورتوں کی بے حرمتی) میں کشمیری مہاجر پنڈت کے ایک خط کو ضمون کی صورت میں درج کیا ہے جن کا نام، کے ،ایل، کول ہے۔انھوں نے روزنامہ میں "الصافہ "سرینگر میں ایک خطہ کے ذریعے لکھا:(۱۸ ستمبر ۱۹۹۰ء)

> "مجھے اخباروں کے کالموں کے ذریعے کشمیری مسلمانوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے کا موقعہ فراہم کیجئے۔۔۔۔کشمیری پنڈتوں کو اپنے مسلمان بھائیوں سے دور کرنے کے جو واقعات پیش آئے یہ سب گورنر جگموہن کی کارستانی ہے۔۔۔بھارت سرکار فرقہ پرستی کا ہوا کھڑا کر کے دنیا کو بے وقوف بنانا چاہتی تھی وہ کشمیر میں تحریک آزادی کو "فرقہ ورانہ ونگ "دے کر دنیا کو بد ظن کرانا چاہتی اور تاثر یہ دینا چاہتی تھی کہ یہاں کے مسلمان ہند آبادی کو اپنے گھروں سے بے گھر کر رہے ہیں۔۵

اس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وادی کشمیر میں فرقہ پرستی کو ہوا دینے والے کوئی اور نہیں بلکہ گورنر جگموہن تھا جنھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں پنڈتوں کے بیچ نفرت کا جذبہ پیدا کیا انھوں نے کشمیری ہندوؤں پنڈتوں کو وادی سے اس لیے نکالا تھا کیوں کہ وہ وادی کشمیر کے نوجوان نسل کو ختم کر کے کشمیری مسلمانوں کو اقلیت میں بدل کر ہمیشہ کے لیے آزادی تحریک دبادی جائے گئی اور پھر ہندوؤں پندتوں کو باحفاظت وآپس اپنے اپنے گھروں کو لائے جائے گا ان ہی وجوہات سے کشمیری پنڈت وادی سے ہجرت کر کے اپنے گھروں سے بے گھر ہو گئے ہیں۔

"سچ بولنا منع ہے"

"سچ بولنا منع ہے" دیپک کنول کا ایک سماجی افسانہ ہے یہ کہانی بھی کشمیر کے المناک صورت حال پر لکھی گئی ہے ۔وادی کشمیر پچھلے تین دہائوں سے جس پُر آشوب سے گذر رہا ہے اس کی عکاسی کہانی کے مرکزی کردار زیرہ فروش قادر شاہ کی معاشی بدحالی اور ذہنی تناؤ سے بخوبی ہو رہی ہے۔ شہر میں پہنچ کر جب ہڑتال کی وجہ سے کالا زیرہ نہ بیچ سکا اور وہ مایوس ہو کر گھر وآپس لوٹ گیا۔اس افسانے کے شروع میں ہی افسانہ نگار نے قادر شاہ کی پریشانی کا ذکر یوں چھیڑ دیتا ہے:

یہ تیسری مرتبہ ہے جب قادر شاہ کو ناکام و مراد ہی لوٹ جانا پڑا تھا۔۔۔۔ شہر پہنچنے کے لیے کتنی مشقت کرنی پڑتی تھی اس سے۔۔۔۔ ساتھ کلوزیرہ ٹھکانے لگ جانے سے پہلے ہی ہڑتا ہو گئی۔۔۔ اب اس سے شہر سے واپس گاڑی کے بجائے اپنی ہی دو ٹانگوں کی سواری کا استعمال کرنا ہو گا۔[۶]

اس کے بعد قاری کی اُمید بڑھ جاتی ہے کہ کہانی وادی کشمیر کی سیاسی و سماجی صورت حال کی صحیح منظر کشی کرے گئی لیکن قادر شاہ اور ایک اجنبی شخص کی گفتگو سے کہانی کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے جس میں افسانہ نگار نے جانبداری کا مظاہرہ کر کے کشمیر کے حریت پسندوں اور وہاں کے عام کشمیری کے خلاف زہر اگلا ہے کہ حریت پسند اپنے اپنے مفاد کے خاطر صرف خون خرابہ کرنا جانتی ہیں اور کشمیری عام مسلمانوں نے پنڈتوں کو کشمیر سے نکال کر ان کی زمین و جائیداد پر قبضہ کر ڈالا ۔انسان کے ذہن پر جس قسم کے ماحول کا اثر پڑتا ہے اس کی سوچ بھی اسی ماحول سے مانوس ہو جاتی ہے چونکہ افسانہ نگار خود ایک ہندو ہے اور اس لیے افسانہ نگار نے مذہب کو بنیاد بنا کر حقیقت سے مُنہ موڑ کر جھوٹ کا پلندہ کھڑا کیا۔افسانے کا مرکزی کردار قادر شاہ اجنبی شخص سے اس طرح وادی کی صورت حال کو بیان کرتا ہیں:

"وادی کشمیر میں جن لوگوں نے بندوقیں اُٹھائی ہیں وہ آئے دن بھیڑ بکریوں کی طرح مرتے کٹتے ہیں ۔۔۔۔ کیا سے کیا بنا دیا اس جنت نظیر وادی کو جہنم بنا کے رکھ دیا اس سے پہلے پنڈتوں کو یہاں سے بھگا دیا ۔۔۔۔ دار صل ہماری نظریں کشمیری پنڈتوں کی زمین و جائیداد پر لگی تھیں۔[۷]

اس اقتباس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ افسانہ نگار نے اپنی سوچ اور فکر سے وادی کشمیر کے عسکری جدوجہد کو غلط رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہے۔انھوں نے وادی کشمیر کے نوجوانوں کو نشانہ بنا کر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے ہی جنت نظیر وادی کو جہنم زار بنا دیا ہے اس صورت حال کو شبنم قیوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"کشمیر میں جب بدنام زمانہ اور مسلمان دشمن گورنر جگموہن کی خفیہ سازش کے تحت کشمیری ہندوؤں پنڈت نکالے گئے تو اس کا مقصد یہ تھا کہ چند مہینوں میں کشمیری مسلمانوں کا قتل عام کیا جائے تاکہ وہ آزادی مانگنے کے نام سے بھی ڈر جائیں۔لیکن اس سازش کے برعکس کشمیریوں نے ہر طرح کے مشکلات کا سامنا کر کے تحریک آزادی کو زندہ رکھا۔[۸]

اس سے یہ نقطہ عیاں ہوتا ہے کہ کس طرح کشمیری ہندو پنڈت وادی کشمیر جھوڑ کر بھاگ گئے اور پھر اپنے ارمانوں کا خون دیکھ کر خود اپنی مرضی سے کشمیری مسلمانوں کو زمینیں بیچ ڈالی تاکہ ہندوستان میں خوش حال زندگی گزار سکیں لیکن اس کے باوجود وہ اس پروپیگنڈہ کر کے مسلمانوں کو بدنام کر رہے ہیں کہ انھوں نے زور زبردستی ان کی زمینیں چھین لی ہیں۔

"شعلے"

افسانہ "شعلے" دیپک کنول کا ایک اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک عورت کو موضوع بحث بنا کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کل کے دور میں عورت کا خوبصورت ہونا اس کے لیے وبال جان بن گیا ہے۔ مردوں کی ہوس پرستی اور عورتوں کی خوبصورتی بعض اوقات یہ آپس میں ٹکراؤ بن جاتا ہے اور یہ ایک دوسرے کے لیے جان لیوا بھی بن جاتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار حاکم دین ہے جو ایک گاؤں کا نمبر دار ہے۔ گاؤں میں کسی بھی قسم کا جھگڑا نمٹنا ہوتا تھا ۔ حکم دین ہر مسلے کو خود ہی نپٹتا تھا۔ مہر دین بھی حکم دین کے ہی گاؤں میں رہتے تھے جو بہت ہی غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے ایک سال پہلے اس کا نکاح گل بودین کی بیٹی بی بی جان سے ہوا تھا نکاح کے بعد جب رخصتی کا وقت آیا تو آچانک گل بودین نے یہ کہہ کر فصلیہ بدل ڈالا کہ جب تک مہر دین پچاس بھڑیں ضمانت کے طور پر جمع نہ کروائے گا تب تک میں اپنی بیٹی بی بی جان کو سسرال نہیں بھیجو گا۔ مہر دین نے اپنی بیوی بی بی جان سے ملنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ ہر طرف ناکام ہونے کے بعد حکم دین جو اس گاؤں کا نمبر دار تھا بالآخر اس نے حکم دین کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مہر دین اس کے سامنے رویا گڑگڑایا حکم دین نے پڑے اطمنان سے اس کی رُداد سنی اور اس سے یقین دلایا کہ آپ کے ساتھ پورا پورا انصاف ہو گا۔ لیکن جب دو گھرانوں کے درمیان شادی بیاہ کا مسلئہ باعث نزاع بن کر نمبر دار کے پاس پہنچتا ہے تو وہ اُس لڑکی یعنی بی بی جان کو دیکھ کر خود اس لڑکی پر فریفتہ ہو جاتا ہے اس سے پہلے بی بی جان اپنا فصیلہ سُناتی تو اتنے میں حاکم دین نے ان کی رائے جانے سے پہلے ہی بازی الٹ کے رکھ دیا اس میں افسانہ نگار نے سماج کے ان ٹھیکیدار پر گہرا طنز کیا ہے جو انصاف کے آڑ میں غریب اور بے بس لوگوں پر خنجر گھونپ کر ان کے گھر بسنے سے پہلے ہی اجاڑ کے رکھ دیتے ہیں:

> مہر دین جو ابھی تک سکتے کے عالم میں بیٹھا تھا اچانک دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کا بس چلتا تو وہ حاکم کا خون پی جاتا لیکن وہ بے بس ہو کر رونے دھونے اور سر پیٹنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔9

حاکم دین عورتوں کے معاملے میں اتنا ماہر تھا اس لیے وہ بازی مار گیا۔ مہر دین روتا سر پیٹتا رہا اور حاکم دین بی بی جان کو ڈولی میں بھٹا کر لے گیا۔ یہاں پر کہانی میں ایک نیا موڑ آجاتا ہے جو کشمیر کے تحریک آزادی کے ساتھ جڑ جاتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار مہر دین زندگی سے تنگ آچکا تھا اب وہ بدلہ لینے کے لیے دہشت گردوں کے صف میں شامل ہو جاتا ہیں آہستہ آہستہ مہر دین نے دہشت گردوں کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھائے وہ ابھی تک مہر دین کے دیئے ہوئے زخموں کو نہیں بھولا تھا کبھی کبھی وہ درد کی شدت سے اتنا چیختا چلاتا تھا اس کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ ساری دنیا کو آگ لگادوں انصاف کے نام

پر ناانصافی کرنے والوں کا نام و نشان تک مٹا ڈالوں۔ایک دن چار دہشت گرد حاکم دین کے گھر میں چھپے بیٹھے تھے کہ فوج نے ان کے گھر پر چھاپہ مارا انھوں نے موقعے پر ہی چار دہشت گردوں کو ڈھیر کیا۔یہاں پر ہی مہر دین نے اپنی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے حاکم دین کو فوج کا مخبر ثابت کر کے اس کے نام موت کا وارنٹ جاری کروادیا:

> اسی رات مہر و دین کی رہنمائی میں تین دہشت گرد اس کے گھر پر نازل ہو گئے اور بال بچوں کے سامنے حاکم دین کو موت کے گھاٹ اتار دیا مہر دین نے چونکہ مُنہ کپڑے سے ڈھانپ کے رکھا تھا اس لیے کوئی اس سے پہچان نہ پایا۔[۱۰]

اس کہانی میں بھی افسانہ نگار نے جانبازی کو دہشت گردی کا لباس پہنا کر ایک طرح سے اپنی بھڑاس بجھائی ہے بندوق بردار کو دہشت گرد مان کر ان سے صرف شر کی توقع رکھی ہے۔دوسرے معنوں میں دیکھا جائے تو افسانہ نگار دیپک کنول کے فکر و سوچ کے مطابق جو بھی اپنے حق اور قوم کی آزادی لیے گن آٹھاتا ہے وہ انسان نہیں بلکہ خونخوار جانور بن جاتے ہے۔

"مخبر"

کشمیر کے پُر آشوب دور کے تعلق سے دیپک کنول کا ایک اور افسانہ "مخبر" ہے اس کہانی کا مرکزی کردار گل ہر سیہ ہے جو پیشے سے دکان دار ہے اسی کام سے اپنے گھر کا خرچہ چلاتا رہتا تھا سب کچھ ٹھیک ٹھاک سے چل رہا تھا نوئی کی دہائی میں جب وادی کشمیر کے حالات زیادہ ہی بگڑ گئے ہر طرف گولہ باری، دھماکے، لوٹ مار، کرفیو اور ہڑتالیں ہونے لگیں۔گل ہر سیہ بھی ایسے ہی حالات کا شکار ہوا جب اس کی دکان ہفتوں بند رہنے لگی تو گھر میں کھانے کی لالے پڑنے لگے۔گل ہر سیہ بھی دوسرے کشمیری نوجوانوں کی طرح تحریک آزادی میں شامل ہو جاتا ہے۔یہاں پر افسانہ نگار کی سوچ اور فکر پر بھرپور روشنی پڑتی ہے ان کے مطابق جن لوگوں کے گھروں میں کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا وہی لوگ اپنے وطن کے لیے بندوق اُٹھاتے ہیں اسی طرح کہانی کا کردار گل ہر یسہ بھی جنگی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے سرحد پار جاتا ہے جب وہ وہاں سے ٹریننگ کر کے آتے ہے ساتھ میں بندوق اور گولہ بارود لے کر واپس آجاتا ہے اور ساتھ ہی اس کے دل و دماغ میں غیر مسلموں کے خلاف نفرتوں کا ایسا زہر بھر دیا جاتا ہے جو بعد میں آتش فشاں کی صورت میں اختیار کر لیتا ہے:

> گل ہر سیہ جو اس تحریک میں شامل ہونے سے پہلے اپنے باپ ہی کی طرح کشمیری ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھتا تھا کیوں کہ تب اس کا ذہن آلودہ نہیں ہو چکا تھا۔۔۔لیکن جب سے وہ سرحد پار سے لوٹا تب سے سے وہ

ایک مسلمان اور کافر کی دوری سمجھ گیا تھا اب وہ خالص اللہ کا بندہ تھا اور اس سے اللہ کی طرف سے جنگ لڑنے کا حکم ملا تھا۔[11]

اس افسانے سے بھی ظاہر ہو رہا ہے افسانہ نگار نے اکثر کہانیوں میں جانبداری کا مظاہر کر کے کشمیری نوجوان جو اپنے جائز مقصد حق خود ارادیت حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں افسانہ نگار اس کو دہشت گردی سے تعبیر کر رہیں ہے چونکہ افسانہ نگار خود ایک ہندو ہے اس لیے یک طرفہ بول کر غیر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے یہ جدوجہد کشمیری عوام کی جدوجہد نہیں ہیں بلکہ سرحد پار دہشت گردی ہے اور اس کی پشت پر پاکستان ہے اور یہ سب کچھ پاکستان کروا رہا ہے۔ لیکن جب ہم وادی کشمیر کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہندوستان نے شروع سے ہی وادی کشمیر کی عوام کی جدوجہد کو پاکستان کے سر تھوپ کر اصل حقیقت سے توجہ ہٹانے کی پالیسی اختیار کر لی اس مسلئے پر "سید علی شاہ گیلانی" یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> بھارت جموں و کشمیر کی متنازعہ حشیت تسلیم نہیں کرتا۔۔۔ جمہوریت کا وہ کون سا راستہ نہیں جو ہم نے اختیار نہیں کیا، لیکن ہماری جمہوری آواز کو گولیوں اور لاٹھیوں سے دبانے کی کوشش کی گئی، اس احساس نے یہاں کے لوگوں خاص کر جوانوں میں اس سوچ کو جنم دیا کہ طاقت کا جواب صرف اور صرف طاقت کی زبان ہی سمجھ سکیں گے۔ اس لیے یہاں کے جوانوں نے سرفروشی کا راستہ اختیار کیا۔[12]

"دیپک بدکی"

دیپک بدکی کا افسانہ "گھونسلہ" کا موضوع ہجرت کشمیر ہے۔ تخلیق کار خود ایک مہاجر ہے جو ۱۹۹۰ء میں وادی کشمیر کے حالات کے ستم ظریفیوں کے تحت اپنے وطن کی روایتی تہذیب و تمدن اور ثقافت کو ایک جانب چھوڑ کر اجنبی شہروں میں بسنے پر مجبور ہوئے۔ افسانے کے شروع میں افسانہ نگار نے وادی کشمیر اور جموں کے ماحول کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے کہ وادی کشمیر کی آب و ہوا برف سے ڈھکے پہاڑ، چنار کے سائے اور روح کو تازگی بخشنے والا صاف شفاف پانی تھا اس کے برعکس ہمیں جموں میں تپتی ہوئی آگ، بادلوں کے لیے ترستا آسمان ایسے ماحول میں رہنا ان کے لیے کسی جہنم سے کم نہیں تھا ۔انسان دنیا میں کسی بھی جگہ رہے، کسی بھی عہدے پر پہنچ جائے مگر وہ اپنی اس زمین اور اس جگہ کو کبھی نہیں بھول پاتا جہاں اس کا بچپن گزرا ہو، جہاں اس نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کیا ہو وہ اس خوش نما جگہ کو بھول کیسے سکتا ہیں ی۔ یہی حادثہ افسانہ نگار کے ساتھ پیش آیا ہے اور اس کو اب اس جگہ سے کوئی وابستگی نہیں رہی جو اس کی پہچان کی پہلی منزل تھی۔ اس

افسانے میں افسانہ نگار نے بیانیہ اسلوب کے بدلے علامتی اسلوب اپنایا ہے کہانی کا مرکزی کردار چڑیا اور چڑے ہے راوی۔ راوی جب جموں پہنچتا ہے تو اس سے وہاں اپنے آفس کے ساتھ ہی رہنے کے لیے ایک ایک کمرہ ملا جس سے وہ صاف کروا کے رہنے کے قابل بنا دیا۔ اس کمرے کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اس ٹوٹے ہوئے شیشے سے روز ایک چڑیا اور چڑا کمرے کے اندر داخل ہوتے تھے دونوں نے بڑی محنت مشقت کر کے چھوٹی چونچوں میں سوکھی گھاس کا تنکا تنکا جمع کر کے اس کمرے کے اندر انھوں نے پیار سے گھونسلا بنایا اور چڑیا نے اس اس آشیانے میں انڈے بھی دے تھے۔ جب اس کا مالک اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دائیں بائیں نظر ڈالی تو چڑیا اور چڑا نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے پورے کمرے کو گندہ کیا تھا تو وہ یہ سب دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا اس نے طیش میں آکر صفائی کرمچاری پر برس پڑ کر کہنے لگا اس کمرے کی صفائی جلدی کرو اور اس کمرے میں بنے ہوئے گھونسلے کو باہر پھینک دو جب اس نے انکار کیا کہ سر! میں اس گھونسلے کو نہیں پھینک سکتا اس میں چڑیا کے انڈے ہیں وہ بھوٹ جائے گے مجھے پاپ لگے اس کے بعد مکان مالک نے خود اس گھونسلے کو کھڑکی کے باہر پھینک دیا اس گھونسلے کا تنکا تنکا بکھر گیا اور سارے انڈے زمین پر گرتے ہوے ٹوٹ گیے۔ دیپک بدکی نے گھر کے مالک کے ذریعے گھونسلے اور انڈوں کی تباہی کے بعد چڑیا پر گزرنے والی قیامت خیز کو عمدگی سے لفظوں کے پیرائے میں یوں بیان کیا:

> ابھی دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ چڑیا اپنے دل میں آرزوں کا سمندر سمیٹے اور چونچ میں روئی کا گالا دبائے گردوں سے آتر آئی۔۔۔۔ بڑی دیر کے بعد اس سے یقین ہو گیا کہ اس کا نشیمن منتقل طور پر اجڑ چکا ہے اور اس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں۔ کہیں پہ کوئی نشان باقی نہیں بچا۔[۱۳]

اس افسانے میں تخلیق کار نے چڑیا اور چڑے کو علامت کے طور پر استعمال کر کے دراصل اپنی اس حقیقی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جب وادی کشمیر میں انہیں کچھ سرکاری اور نیم سرکاری تنظیموں نے اپنے ذاتی مفاد کے خاطر ان کو اپنے گھروں سے بے گھر ہونے پر مجبور کر دیا جس طرح چڑیا کے ان تھک اور پیار سے بنائے ہوئے آشیانے کو بڑی بے دردی سے اس کے آشیانے کو اُجاڑ دیا گیا اس طرح کشمیری ہیندو پنڈتوں کے آشیانے بکھر گئے جو کبھی دوبارہ نہ بن سکے پھر چاہے انہوں نے اپنی مرضی سے یا سرکار کی دباؤ میں آکر اپنے آبائی وطن کو چھوڑ پر مجبور ہوئے لیکن انہیں اپنے وطن اپنے گھروں سے دوری کا درد اور اپنے احباب سے بچھڑنے کا احساس آج بھی خون کے آنسوؤں رولانے پر مجبور کرتا ہیں۔

"زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی"

افسانہ "زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی" کا موضوع بھی کشمیری پنڈتوں کی نقل مکانی اور جموں میں آئے دن مشکلات اور حادثات کا سامنا اس کہانی کا بنیادی موضوع ہے یہ کہانی ایک ایسے مظلوم اور ادھیڑ عمر کسان کی داستان ہے جو وادی کشمیر کے دہشت زدہ ماحول کی وجہ سے اپنی زمین سے اُکھڑ گیا ہے وہ زندگی کی ایسی زیبرا کراسنگ پر کھڑا ہے جہاں وہ یہ طے نہیں کر پا رہا ہے کہ وہ اس زیبرا کراسنگ پر کو کس طرح پار کرے کیوں کہ کچھ دنوں پہلے انھوں نے اس نئے اور اجنبی شہر کے روڑ کراسنگ پر اپنا لخت جگر جوان بیٹا بھی کھویا دیا تھا جو اس مظلوم اور بوڑھے کسان کا آخری سہارا تھا۔ آج یہ بوڑھا کسان بھی پچھلے ایک گھنٹے سے اسی زیبرا کراسنگ پر روڈ پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ اجنبی کا شہر کا روڈ ایسا تھا جہاں گاڑیوں کی آمد رفت روکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں دوسرا اس روڈ پر نہ کوئی ٹرافک پولیس اور نہ ہی کوئی ہاتھ کا سہارا دے کر روڈ پار کرانے والا تھا بوڑھے کسان نے کئی مرتبہ روڈ پار کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس سے اپنے بیٹے کی موت بار بار خوف زدہ کر رہا تھا وہ سوچتا ہے کوئی گاڑی بیٹے کی طرح مجھے بھی کچل کر نہ رکھ دے کیوں کہ اس سے اپنے گھر کی بال بچوں کا ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا اس لیے بوڑھا کسان کسی جان لیوا حادثے کا نہیں ہونا چاہتا تھا یہ سب نئی نئی چیزیں نئے اور اجنبی شہر میں دیکھ کر اس سے اپنے وطن کی بہت یاد آتی ہے اور اس کا ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتا ہے اور ان کے دل پر عجیب سی بے چینی اور قلق کا عالم تھا:

> ہمارے شہر میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔ وہاں اگر کوئی بوڑھا یا بچہ سڑک پار کر رہا ہو دوسرے لوگ اس کی مدد کے لیے سامنے آتے ہیں اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے راستہ پار کرواتے ہیں۔ [۱۴]

اس میں افسانہ نگار نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کشمیری بنڈتوں کو جب اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی تو انہیں طرح طرح کے مسائل و مشکلات کا سامنا کرپڑا اور ان لوگوں کو جن اندوہ ناک حالات سے گزرنا پڑا اس کی وجہ سے یہ لوگ ذہنی طور پر لاغر ہو گئے اور ان کی لوگوں کی کی سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں ختم ہو گئی ہیں جس طرح افسانے کا مرکزی کردار بوڑھا کسان کو سمجھ نہیں آرہی روڑ کیسے پار کروں، لیکن بوڑھا کسان تو اجنبی وطن میں مجبور تھا اس کو تو ریلف حاصل کرنے کے لیے دس کلو میٹر دور جانا تھا کیوں کہ بیٹے کے مرنے سے پہلے ان کو سولہ سو ملتے تھے اب بارہ سو ہی ملتے ہے اس کے پاس تو کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ ان کے پاس جو کچھ مال واسباب تھا وہ سب کچھ اپنے وطن ہی میں چھوڑ کر اپنے بال بچوں کی زندگی بچانے کی کوشش میں بھاگ رہا تھا، کہاں وہ آبائی وطن میں اناج کے انبار اور تین منزلہ گھر اور کہاں اجنبی شہر میں یہ

معمولی ٹینٹ اور کہاں یہ دانے دانے کی محتاجی یہ سب یادیں بوڑھے کسان کو اجنبی شہر میں رولانے پر مجبور کرتی تھی اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال آتا تھا کہ آخر مجھے اپنی زمین اور اپنے ہی وطن میں رفوجی کیوں بنا پڑا وہ سوچتا ہے میں بھی تو اس وادی گلپوش کا ایک فرد تھا اتنے میں سڑک کے کنارے پر پانی بیچنے والے شخص نے بوڑھے کسان کو پانی کا گلاس پیش کیا اور پھر بوڑھے کسان سے مخاطب ہو کر بول پڑا بابو جی، اپ کچھ پریشان لگ رہے ہو، اپ کس دیش کے باسی ہے ؟:

دیش! ارے بھائی میں بھی اس دیش کا رہنے والا ہوں"

یہ کہہ کر اس کے مُنہ پر جیسے تالے پڑ گئے۔۔۔۔ کچھ واقفے کے بعد وہ من ہی من میں سوچنے لگا،، اس دیش کا باسی؟ میں اس دیش کا باسی کیسے ہوں؟ اپنے دیش میں کوئی رفیوجی بن کر جیتا ہے کیا؟۔۱۵

اس افسانے کے مطالعہ کے بعد افسانہ نگار کی سوچ اور انداز فکر پر بھرپور روشنی پڑتی ہے مصنف ایک ادیب اور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ خود ایک مہاجر ہے۔ اس لیے انہیں مہاجروں کے مسائل کا بخوبی اندازہ ہے ان سے بہتر اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ ہجرت کے بعد کشمیری پنڈتوں کے اہل خانہ اور گھر والوں کو اجنبی دھرتی پر کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ جس سے مرکزی کردار بوڑھے کسان نے ہجرت کے دوران اپنا آبائی وطن ہی نہیں کھویا بلکہ انھوں نے اجنبی شہر میں اپنا بیٹا بھی کھو دیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک انسان کو ایک دھرتی سے دوسرے دھرتی پر آباد ہونا صرف بے زمینی کے کرب کو ہی اجاگر نہیں کرتا بلکہ وہ انسان اپنے دیش کی پوری تہذب، روایات سے منقطع ہو جاتا ہے اسی طرح کشمیری پنڈتوں کے لیے جموں ایک اجنبی شہر تھا وہاں کی تہذیب و تمدن وادی کشمیر کی تہذیب و تمدن سے بالکل مختلف ہے اس لیے آج بھی ہزاروں کشمیری پنڈت ہندستان کے مختلف شہروں میں آج بھی بے شمار مسائل سے دوچار ہے جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہیں دی انھوں نے عالم انسانیت کے سامنے ایک سوال کھڑا کیا ہے۔ آخر ہمیں اپنے ہی دیش میں رفیوجی کیوں کیوں بننا پڑا؟

"چنار کے پنجے"

دیپک بدکی کی ایک اور کہانی "چنار کے پنجے" وادی کشمیر کے اُس پُر آشوب دور سے تعلق رکھتی ہے جس نے ہر کشمیری کو اندر سے توڑ کر کے رکھا ہیں وہ وادی جو کبھی اپنی خوبصورتی کی وجہ سے جنت نظیر وادی کہلاتی تھی اب کچھ سیاسی

سودہ گروں کے مکروہ عزائم سے جہنم زار بنا کر جبری تقسیم کر کے بیٹے کو باپ سے بہن کو بھائی سے جدا ک ہونے پر مجبور کر دیا۔

کہانی میں بھی تخلیق کار نے بیانیہ اسلوب کے بدلے علامتی اسلوب اپنایا ہے "چنار" کو کشمیر کے مسلم معاشرے سے اور چھوٹے پیڑ پودوں کو اقلیتی ہندوں فرقہ سے تعبیر کیا ہے راوی جو وادی کے خراب حالات کے پیشِ نظر اپنا گھر اور شہر کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد جب وہ اپنی سرزمین پر لوٹتا ہے تو اس سے ہر چیز بکھری بکھری نظر آتی ہے وہ اپنی ہی زمین پر خود کو اجنبی اور تنہا محسوس کرتا ہے جو گھر اور وطن پہلے اس کے لیے مانوس تھا آج وہی اس کے لیے وحشت کا باعث بنا ہوا ہے اپنے دھرتی کو دیکھ کر فکر کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہے تو اتنے میں "چنار" کا ایک زرد پتہ ٹوٹ کر اس کے مُنہ سے لپیٹ جاتا ہے یہ زرد پتہ اُن لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو وادی میں ظلم و تشدد کے باوجود وہ کشمیر میں رہ رہے ہیں اور ڈٹ کے وادی کے نامساعد حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں کچھ وقفے کے بعد اس زرد پتے کو زبان مل جاتی ہے اور راوی سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> گھبراؤ مت دوست! میں ہر روز یہ گھن گھرج سُنتا تھا۔ جب گردوں پر کالے بادل منڈلاتے تھے۔۔۔اس وقت میں اپنی شاخ سے لپٹا ان ناسازگار حالات کا مقابلہ کرتا تھا اور کبھی گھبراتا نہیں تھا۔[۱۶]

راوی یہ باتیں سن کر زرد پتے سے سوال کرتا ہے:

> "اس درخت کے لیے تم نے اپنا سب کچھ لُٹا دیا، رات دن تم نے اس کی حیا بخشی پھر تمہارا یہ حشر کیوں ؟۔[۱۷]

دونوں ایک دوسرے سے ایسا سوال و جواب کرتے ہے یوں محسوس ہوتا ہے دونوں ایک دوسرے سے گلہ شکوہ کر رہے ہیں ۔راوی پھر وہاں کے اندوہ ناک صورت حال کو دیکھ کر اپنے آپ سے ہی سوال کرتا ہے اور وادی گُلپوش کے موجودہ صورت حال کو چند الفاظوں میں بیان کرتا ہے:

> مجھے اس موسم میں یہاں نہیں آنا چاہے تھا۔ آخر ہے کیا یہاں؟ ویرانی۔۔۔۔چاروں جانب ویرانی ۔۔۔[۱۸]

اس کے بعد زرد پتہ راوی سے مخاطب ہوتا ہے:

دوست ! تم نے اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا یہاں۔۔۔۔۔بے شمار گھر اُجڑ گئے۔ان گنت پودے اپنی دھرتی سے اُکھڑ گئے پانی کی ریلوں کے ساتھ بہتے چلے گئے میں نے اپنی آنکھوں سے وہ دل سوز مناظر دیکھے۔19

اس افسانے میں افسانہ نگار نے جانبداری کا مظاہرہ کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ریاست جموں و کشمیر میں رونما ہونے والے حالات وقعات سے نہ صرف اہل ہند ہی متاثر ہوئے ہے بلکہ وادی کشمیر کے مسلمانوں کو بھی ان پریشا نیوں سے دوچار ہونا پڑا۔اس میں افسانہ نگار نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وادی کشمیر میں زیادہ تر آبادی مسلم فرقے سے تعلق رکھتی ہے اور اکثریت میں ہونے کے ناطے محفوظ بھی۔اس لیے ہر طرح کی سر گرمیوں میں حصہ لینے افراد مسلمان ہی ہے جنھوں نے ہر طرح کے مشکالات کا سامنا کر کے اپنے وطن کی تحریک آزادی کے خاطر لاکھوں کشمیریوں نے جانیں قربان کر دی اور دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد خصوصًا کشمیری پنڈتوں نے وادی کشمیر کے بدلتی ہوئی صورت حال کا مقابلہ نہ کر سکے جس کی وجہ سے اپنی جان بچانے کے لیے وہ اپنا گھر اور وطن چھوڑ کر چلے گئے۔

"مخبر"

افسانہ "مخبر" دیپک بدکی کے شاہکار افسانوں میں شمار ہوتا ہے یہ ذہنی کشمکش اور احساس محرومی کی آگ میں جلتے ہوئے لوگوں کی کہانی ہے اس افسانے کا بھی موضوع وادی کشمیر کے پُر آشوب حالات واقعات ہیں جہاں پر آئے دن کئی لوگوں کو بے دردی سے موت کی گھاٹ اترا جاتا ہے جس کی وجہ سے عوام کے اذہان میں خوف بیٹھ جاتا ہے اسی طرح جب قصبے میں افواہ پھل جاتی ہے کہ مخبروں کو موت کے گھاٹ اُتارا جارہا ہے تو ہر شخص کے چہرہ خوف سے زرد ہو جاتا ہے اور ان کے ذہنوں میں صرف ایک سوال آتا ہے مخبروں کے لسٹ میں کہیں میرا نام تو نہیں آیا؟اس طرح ہر ایک شخص اپنے بچاؤ کے لیے کوئی نہ کوئی ترکیب سوجھتا ہے کوئی معافی نامہ پیش کروا کے اپنی بے گناہی کی صفائی پیش کرتا ہیں تو کوئی ان حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے وادی گُلپوش کو الودع کہہ دیتا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار نیل کنٹھ بھی اس خوف وہراس کا شکار ہوتے ہے نیل کنٹھ کی بیوی اُرن دتی نے جب اس سے دیکھا تو وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اُرن دتی نے اپنے شوہر کو اتنا گھبریا کبھی نہیں دیکھا تھا جتنا آج وہ لگ رہا تھا شام ہوتے ہی مرکزی کردار نیل کنٹھ اپنے گھر کی ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیتا تھا اور رات کو بھی نید میں جاگ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر کے ماحول کا جب جائزہ لیتا ہے تو اس سے باہر فوجی اور جیپسیوں کی نقل و حرکت کے سوا کچھ نظر آرہا تھا۔اُرن دتی اپنے شوہر نیل کنٹھ کو پریشان دیکھ کر سوال کرتی ہے، آج آپ کو کیا ہو گیا ہے ؟ نیل کنٹھ کو آخر کار سچ بات اس سے کہہ ہی دیتا ہے:

میں گھبرا نہیں رہا ہوں۔ مگر اُرنی،، تمہیں نہیں معلوم حالات بہت خراب ہو چکے ہیں۔ ہر جگہ موت کا تانڈو ہو رہا ہے، بھگوان ہی جانتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے؟ ۲۰

یہ باتیں سن کر اُرن دتی کو ماضی کے وہ دن یاد آئے جب وادی کشمیر پر قبائیلوں نے حملہ کیا تھا اس وقت وہ صرف اٹھارہ سال کی تھی ان دنوں اُرن نے ان حالات کا مقابلہ بڑی ہمت اور دلیری سے کیا تھا اب جب کہ آج بھی وہی حالات دوبارہ ان پر آن پڑے تو وہ ہمت باندھ کر نیل کنٹھ سے مخاطب ہوئی:

گھبرانے سے کوئی فائدہ نہیں جی ہم نے تو قبائلی ریڈ دیکھا ہے اس کے مقابلے میں تو یہ وارداتیں کچھ بھی نہیں، جسے تیسے جھیل لیں گے یہ بھی آپ دل چھوٹا نہ کرو۔ ۲۱

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وادی کشمیر کی غلامی کی تاریخ بڑی لمبی ہے وادی کشمیر پہلے ڈوگراہوں کے ظلم و ستم کا شکار رہی پھر ان کو بھاگنے کے لیے قبایلوں نے وادی پر حملہ کر لیا انھوں نے بھی وہاں لوٹ مار شروع کر دی۔ اب ظلم و جبر ،استحصال اور غلامی کے ایک نئے دور نے جنم لیا جو گزشتہ ستر سال سے مسلط ہے اب کشمیریوں میں اتنا خوف ہے کہ جو سب لوگ یہی سوچ رہے ہیں کہ پتہ نہیں اگے کیا ہو گا یعنی لوگ نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو رہے ہیں جس طرح اس کہانی کا کردار اُرن دتی کے سمجھانے پر نیل کنٹھ کے بے چینی اور بے قراری پر کوئی فرق نہیں پڑتا نیل کنٹھ پھر بھی بار بار کمروں کی کھڑکیوں اور دروازوں کا معائنہ کرتا رہتا تھا جب تک اس کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ اب کھڑکیوں اور گھر کی دروازے بند ہو گئی ہے تب تک وہ کمرے میں بے چین ہو کر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا تھا ان کو نید آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ بستر میں بار بار کروٹیں بدلتا رہا اتنے میں باہر سے دروازے پر دستک ہوئی دونوں میوں بیوں کانپ اُٹھے اسی اثنا میں دو نقاب پوش دروازہ توڑ کر اندر آئے:

انھوں نے نہ آگے دیکھا نہ پیچھے اندھا دھند فائرنگ کی، مگر اس سے پہلے ہی دونوں روحیں خوف دہشت کے باعث جسم خاکی سے پرواز کر چکی تھیں۔ ۲۲

اس افسانے میں دیپک نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کشمیر کے اندوہ ناک صورت حال نے ہر انسان کو ابتر کر دیا ہے جس کی وجہ سے لوگ اب خوف سے ہر پل مر رہے ہیں کوئی بھی انسان اپنے ہی گھر میں خود کو محفوظ نہیں سمجھتا ہر جگہ خوف وڈران کا پیچھا نہیں چھوڑتا افسانہ نگار نے اس حقیقت کو بھی واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وادی کشمیر میں کوئی بھی ایسی جگہ محفوظ نہیں جہاں لوگ یہ محسوس کر سکیں کہ وہ اب اس تشدد کے دائرے سے باہر ہے بلکہ وہاں کے لوگ تو بار بار اپنے

مستقبل کے بارے میں خوف زدہ رہتے ہیں اور بار بار اسی خوف میں جی رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور آگے کیا ہو گا کیوں کہ مظالم نے تو پہلے ہی ان کا جینا حرام کر رکھا ہے نہ وہاں کے بچوں کی زندگی محفوظ ہے نہ وہاں کے بچیوں کی عزتیں محفوظ اب تو وہاں جوانوں، بزگوں اور بچوں پر تشدد روز کا معمول بن گیا ہیں۔

"دستک"

مندرجہ بالا افسانہ نگاروں کی طرح ویریندر پٹواری کا شمار بھی وادی کے حساس افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے انھوں نے بھی وادی کشمیر کے درد کو بڑی باریک بینی سے سمجھا اور پرکھا ہیں اور وہاں کے خون آشام ماحول کو موضوع بنا کر کشمیریوں کے دکھ درد کو نہایت ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ان مسائل کو اپنی فنکارانہ بصریتوں اور فنکارانہ صلاحتوں سے نئے نئے رنگ اور نئے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اپنی کہانیوں میں علامتوں کا ایسا استعمال کیا ہے جس میں وادی گالپوش کے حالات اور کشمیریوں کے مسائل کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے جس کی مثال ان کے افسانہ "دستک" سے ملتی ہے اس میں افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وادی کشمیر میں بیشتر بے بس اور لاچار مائیں ایسی ہیں جن کی کوکھ ہی اجڑ چکی ہے اولادیں جننے کے باوجود وہ اپنے لخت جگروں کی ایک جھلک دیکھنے کو تڑپ رہیں ہیں اپنے جگر کے ٹکڑوں کی جدائی میں ان کا ایک ایک پل درد اور تڑپ میں گزرتا ہے۔ ہر آہٹ اور آواز پر وہ مائیں چونک پڑتی ہے کہ ہمارے پیارے واپس اگئے ہیں۔ ایسی ہی حالاتوں کا شکار کہانی کا مرکزی کردار خالدہ بھی ہوئی ہے ان کا شوہر خالد مستانہ جو کشمیری موسیقی کے بادشاہ تھے ان کی آواز ہر دل کی دھڑکن تھی۔ وادی کی گلی کوچوں میں ان کی میٹھی آواز ہر کان میں رس گولتی تھی لیکن کشمیر کے اندوہ ناک صورت حال نے ان کو بھی نہیں بخشا اس شورش ذدہ ماحول سے انھوں نے تو اپنا شوہر کھو دیا مگر اس کو اب اپنے بیٹے مشتاق کی فکر لائق ہو رہی تھی وہ ہر وقت اُن کا راستہ دیکھتی رہتی تھی:

> خالدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھتی رہی۔۔۔۔ان کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کا بیٹا مشتاق لوٹ آیا ہو مگر جب اس شخص نے اپنے چہرے سے نقاب اُٹھایا تو خالدہ نے اپنے شوہر کے شاگرد اشتیاق کو فوراً پہچان لیا مگر ان کے کندھوں پر من پسند ساز سارنگی کے بجائے بندق دیکھ کر خوف ذدہ ہو گئی! کیوں کہ یہی وہ لڑکا تھا جو اپنے بہت ہی امیر باپ کے کاروبار کو فروغ دینے کے بجائے جرمنی سے لوٹ کر خالد مستانہ سے وحدت کے سبق پڑھ کر کشمیری صوفیانہ موسیقی سیکھ رہا تھا۔ ۲۳

اس اقتباس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ افسانہ نگار نے اشتیاق کے کردار کو پیش کر کے وادی کشمیر کے ان نوجوانوں کی عکاسی کی ہے جنھوں نے تعلیم حاصل کی اچھا ہنر سیکھا لیکن وادی کی کرب ریزی نے انہیں بندق اُٹھانے پر مجبور کیا وادی میں اشتیاق جیسے ہزار جوان ایسے ہیں جو اُس وقت پیدا ہوئے جب وادی گُلپوش میں ہر جانب صرف گولیوں اور دھماکوں کی گھن گھرج تھی۔ انھوں نے اپنے عزیزوں، پیاروں، بے گناہوں اور معصوموں کو اپنی آنکھوں کے سامنے گولیوں سے بڑی بے دردی سے مرتے دیکھا ہے تو کشمیری نوجوان بندوق اور پھتر نہیں اُٹھائے گے تو کیا کرے گے۔

خالدہ کا شوہر خالد مستانہ کی روزی روٹی تو موسیقی سے جڑی تھی جب کشمیر میں حالات پُر سکون تھے تو ہر شہر کے گلیوں کوچوں میں ان کے نغموں کی گونج سُن کر ٹریفک تھم جایا کرتا تھا لیکن آج ان ہی گلیوں میں شام ہوتے ہی کرفیو لگ جاتا ہے خالد مستانہ جو بڑے بڑے لوگوں کی فرمائش پر گاتا تھا آج وہ پھری والوں کی طرح سُنا سُنا کر اپنی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے پھر وہ خود اپنی ان حرکتوں کو دیکھ کر ہنستے ہنستے رو پڑتا تھا مگر خالدہ کو بے بس ہو کر نہ بیٹے کی جدائی برداشت ہو رہی ہے اور نہ وہ اپنے شوہر کا کرب دیکھ پاتی ہے جب خالدہ نے اشتیاق کا خط کھولا کے پڑنے لگی تو اُس پہ لکھا تھا۔ اشتیاق نے جب اپنے استاد محترم کی ذہنی حالت دیکھی تو انھوں نے اپنی آنکھیں اور گردے بیچنے کا ارادہ کر لیا لیکن چند قدم آگے چل کر ان کے استاد گر گئے۔ اشتیاق نے اپنے استاد کو اُٹھانا چاہا لیکن تب تک وہ ابدی نید سو چکا تھا اُسی وقت وہاں کراس فائرنگ بھی ہو رہی تھی اس لیے اشتیاق نے استاد کے گھر والوں کو فائیدہ پہنچانے کے لیے ان کے مرنے کی خبر زور و شور سے پھیلا دی اشتیاق نے خط میں مزید یہ بھی لکھا تھا:

> کسی کو بھی نہ بتایا جائے کہ خالد مستانہ کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا اور وہ دو تین بار پہلے بھی خود کشی کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔۔۔ ورنہ سرکار کی طرف سے ایک لاکھ روپے نہیں ملے گا۔ ۲۴

جب خالدہ اس خط کو پڑتی ہے تو سارے راز ان کے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہے کہ خالد مستانہ کی موت کیسے ہوئی خالد مستانہ کو ایک آسرا مل چکا تھا کہ وہ ان تمام پریشانیوں سے چھٹکارا کے لیے خود کشی کا راستہ اپنا لیا صبح ہوئی تو پولیس نے خالدہ کے گھر پر دستک دیتی رہی اور اس کے محلے والے بھی دروازے کُھلنے کا انتظار کر رہے تھے جب دروازہ نہیں تو لوگوں کو مجبوراً دروازہ توڑنا پڑا جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا خالدہ خود ہی موت کو دعوت دے کر شوہر کے پاس جا چکے تھی لاش کے پاس ایک خط پڑا جس پر مختصراً لکھا تھا:

> آپ کی دستک سننے سے پہلے ہی میں اپنے ضمیر کی دستک سُن چکی ہوں"

"میرے شوہر کو کسی نے نہیں مارا ہے! مگر ہم دونوں کو موجودہ حالات نے مار ڈالا ہے"

"کاش ذی ہوش امن پسند لوگ مظلوم لوگوں کی دستک سن سکتے۔۲۵

اس کہانی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نقط عیاں ہوتا ہے کہ وادی میں پیدا شدہ حالات و واقعات نے وہاں کے مظلوم اور بے بس والدین کے اذہن پر کس طرح متاثر کیا جس طرح کہانی کا کردار خالد مستانہ نے نے کشمیر کے پُر آشوب حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے تمام پریشانیوں سے چھٹکارہ پانے کے لیے خودکشی کا راستہ اپنالیا۔ خالدہ اور خالد مستانہ جیسے نہ جانے کتنے کشمیری والدین ہیں جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو دیکھنے کی حسرت میں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ کشمیری والدین اپنے بچوں کی حصول تعلیم کے لیے اپنے بچوں کو وادی کے دہشت زدہ ماحول اور بندوق کے بغیر ان کا بہتر اور پُر وقار مستقبل بنانا چاہتے ہیں مگر ان کے بچوں کی تعلیم وہاں کے لیڈروں کو ایک آنکھ نہ بھاتی جو نہ صرف ان کو تعلیم کی دولت سے محروم کر رہے ہیں بلکہ ان کو اپنی زندگی سے بھی محروم ہونے کے لیے بندوق اُٹھانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس میں افسانہ نگار نے ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہاں کے نوجوانوں کو پانی کے لیے بندوق اُٹھانی ہے، بجلی کے لیے پتھر پھینکنا ہے، نوکری کے لیے قتل کرنا ہے، ان کو وطن کی آزادی کے لیے دہشت گرد بننا پڑتا ہے۔ کیوں کہ حکومت نے اس بات کوئی آپشن نہیں چھوڑی ہیں۔ تخلیق کار نے اس بات کو بھی واضع کیا کہ وہ اب جوانوں کو دہشت گرد کہے یا گمراہ نوجوان اب تو ان کے پاس بندوق اُٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کیوں کہ بندوق کے بغیر نہ ان کے پاس کوئی نوکری ملے گئی نہ آزادی چونکہ کہ وہاں کی کٹ پتلی حکومت ہی امن پسند لوگوں کے ہاتھوں میں بندوق دینے کے منصوبوں میں مصروف عمل نظر آرہے ہیں۔

"سزا"

"سزا" ویریندر پٹواری کا ایک ایسا تخلیق کردہ افسانہ ہے جس میں انھوں نے وادی کشمیر کے حالات و واقعات کی بڑے موثر انداز میں عکاسی کی گئی ہے اس کہانی میں بھی ویریندر پٹواری نے علامتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے جن علامتوں سے یہ بات صاف عیاں ہوتی ہے کہ وادی کشمیر کے حالات نے کب اور کون سا رُخ اختیار کیا اور وہاں کے مظلوم باسیوں کو کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے افسانے کا مرکزی کردار دھواں اور دھند کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ دھند وادی کشمیر کے مظلوم اور بے بس عوام کی علامت ہے وہیں دھواں اُن شر پسند لوگوں کی عکاسی کی گئی ہے جن کی وجہ سے

کشمیری عوام پچھلے ستر سالوں سے طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہے ہیں اس منظر کی عکاسی ویریندر پٹواری نے یوں کیا ہے:

> دھواں میری آنکھوں کو جلا رہا ہے، میری سانسوں کو دبوچ رہا ہے۔۔۔۔ میں رینگتا ہوا کھڑکی تک تو پہنچ گیا ہوں مگر دھوئیں نے تازہ ہوا کو روک رکھا، دھند کہہ رہی ہے کہ میں انسان کی دوست ہوں، قدرت کا وہ کھیل ہوں جو انسان کو سنبھل سنبھل کر چلنا سکھاتی ہے اور تم کائنات کے دشمن ہو، تم سرسبز جنگلوں ،ہرے بھرے کھیتوں، مہکتے گلزاروں اور شاداب زندگی سے لپٹ کر ان کا کالا اور بے جان کر دیتے ہو!۲۶

اس اقتباس میں افسانہ نگار نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وادی کشمیر کے لوگ امن پسند ہے، انصاف پسند ہے، ظلم اور ظالم سے نفرت کرتے ہیں مگر جلاد پسند لوگوں کی وجہ سے جنت کا حسین ٹکڑا جلادوں کے شکنجے میں گھیرا ہوا ہے یہ جالاد لوگ کشمیری لوگوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے ہے اان کشمیریوں کو اپنی ایسی ایسی سزائیں دی جاتی جس سے ہر روز کئی بچے یتیم، کئی عورتیں بیوہ اور کئی گھرانے پورے کے پورے اجاڑ جاتے ہیں اور وہ پھر وہ اس ظلم و ستم سے تنگ آکر جلد ہی موت کو گلے لگا لینے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔اس طرح دھواں کی علامت کے ذریعے ویریندر پٹواری نے کشمیری عوام کے مسائل کو تیسری آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس نتجے پر پہنچے ہیں کہ ۱۹۳۱ سے لے کر آج تک کشمیری عوام نہ صرف غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے بلکہ جانی نقصان کے ساتھ ساتھ مالی نقصان کا بھی خمیازہ بھگت رہے ہیں:

> مجھے یاد ہے بلکہ ۲۵ سال فوجی قید میں رہ کر یہی ایک بات جو میں بھول نہیں پایا ہوں۔۔۔۔ میرے پُردادا کو ۱۹۹۳ میں شاہی راج کی گولی کھا گئی! اور دادا کو ہندوؤں کو بچانے کے الزام میں ۱۹۴۷ میں قبائلیوں نے قتل کر دیا! ابا کو ۱۹۴۵ء کی لڑائی کھا گئی اور میں ۱۸۷۱ء کی لڑائی میں چھمب سیکٹر میں قید ہوا۔۔۔۔ اور اب میرا بیٹا؟ وہ ۲۱ سال کا یوگا! کہیں وہ اُن معصوم لڑکوں میں سے ایک تو نہیں تھا جن کو پکڑنے کے لیے شکاری نکل پڑا ہے۔۲۷

اس طرح ویریندر پٹواری نے اس افسانے کے ذریعے وادی کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام رجحانات، معاشی بدحالی اور کسمپرسی کی عکاسی ہے اور ساتھ چار نسلوں کے اوپر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے مزید انہوں نے تجریدی رویہ کو اپناتے ہوئے یہ افسانہ وجود میں رائی ہے جس کے موضوع سے ہی معلوم ہو جاتا کہ یہ افسانہ اسلوب اور طرز نگارش کے اعتبار سے منفرد ہے۔

"برف"

ویریندر پٹواری کا ایک اور علامتی افسانہ "برف" ہے یہ افسانہ فسادات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔اس کہانی میں تخلیق کار نے وادی میں فسادات سے پیدا ہونے والے مسائل کو بڑے ہی خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔اس میں افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ محبت کا کوئی دھرم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی سرحد ہی مقرر ہیں۔اس کہانی میں ایک لڑکی اور لڑکے کی محبت کو موضوع بنایا گیا ہے جو ایک دوسرے کے محبت میں اس قدر گرفتار ہو جاتے ہیں جو انہیں اپنی ذات برادری یہاں تک کہ وہ مذہبی سرحدیں بھی توڑ دیتے ہے جس سے ہندو مسلم کے درمیان نفرت کا ایسا زہر پیدا ہو جاتا ہے جو اس لاوے کی طرح تھا جو بعد میں آتش فشاں کی صورت اختیار کرتا ہے اسی طرح لڑکی اور لڑکے کے گھر والے ہر جگہ ان کے تلاش میں لگ جاتے ہیں مگر ان دونوں کو کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی جہاں وہ چین و سکون سے سانس لے سکتے تھے وہ جس طرف مُنہ موڑتے اُس طرف انہیں سرگوشیوں کی آوازیں سننے کو ملتی ہے۔ہندؤ کہہ رہے لڑکی ہندؤ ہے اور مسلمان کہہ رہے لڑکی مسلمان ہے۔اس طرح کی افواہوں سے پیدا ہونے والے واقعات سے ہندؤ اور مسلمان کے بھائی چارہ اور رواداری کو ٹھیس پہنچتی ہے اس سارے منظر کی عکاسی افسانہ نگار نے یوں کی ہے:

> دونوں فرقہ پرستی کی دیواریں توڑ کر، قدم قدم پر موجود دراڑیں پھاند کر فقط ایک دوجے کی پریت کی خاطر، سر پر کفن باندھ، کر اپنے گھر سے بہت دُور نکل آئے تھے۔۔۔۔ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کی لڑکی کو ورغلا کر لے گئے ہیں! جب کہ دوسرے فرقے کے لوگ سمجھ رہے ہیں کہ اس فرقے کے لوگ اُن کے ایک آدمی کو اِغوا کر کے لے گئے ہیں۔۔۔۔لیکن ان میں کون ہندو اور مسلمان کوئی نہیں جانتا تھا۔۲۸

اس کہانی کے دوسرے پہلو میں افسانہ نگار نے "برف" کے ٹکڑے کو علامت طور پر وادی کشمیر کے درد دل رکھنے والے ان اشخاص کی بھی عکاسی کی ہے جو وادی گُلپوش کے درد کو اپنا ذاتی درد سمجھتے ہیں جو اس جنت نما وادی کو کسی بھی قسمت پر اُجڑتا ہوا نہیں دیکھ پاتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہے جس جنت کے ٹکڑے پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے یہ ہمیں اپنی اولاد سے بھی پیاری ہے اسی سے تو ہمارا ماضی، حال اور مستقبل پڑا ہوا ہے یہی ہمارا آج اور کل کا سہارا ہے جس کو گولیوں سے چھلنی کیا جا رہا ہے:

ہمارے شکارے ہمیں اپنے بچوں کی طرح پیارے ہیں! ہم ان کا نام دیتے ہیں! جسے میرے شکارے کا نام 'جنت' ہے۔۔۔۔ وہ دیکھو جنت درد کی شدت سے تڑپ رہی ہے۔[۲۹]

اس میں افسانہ نگار نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب کچھ لوگ فرقہ پرستی کو ہوا دے کر ہندوؤ اور مسلمانوں کو لڑوتے ہیں تو پھر گولیوں کی شور وغل سے آسمان بھی لرز جاتا ہے اور معصوم جانوں کے ساتھ ظالمانہ کھیل کھیل کر اور صدیوں کے امن بھائی چھارہ کو جنگ وجدل میں تبدیل کر رہے ہیں کبھی اللہ کے نام تو کبھی بھگوان شنکر کے نام پر تو کبھی مسجد ومندر کے نام پر انسانیت کا قتل کیا جارہا ہے:

ایک جوان نے کہا ساتھیوں سے جھیل کے کنارے پر ایک مندر بنائیں گے دوسرے نوجوان نے اپنے ساتھیوں سے کہا دیکھتے ہیں یہ کافر لوگ یہاں کیسے بُت پرستی کریں گے؟۔۔۔۔ پھر برف باری شروع ہوئی ! میں برف کی نئی تہہ اُوڑھ کر سونا چاہتا ہوں، مگر لاشوں کے ساتھ نوحہ خوانی کرتی ہوئی دو عورتیں بار بار چیخ چیخ کر فریاد کرتی ہیں۔[۳۰]

اس اقتباس ظاہر ہورہا ہے کہ کس طرح وادی کشمیر میں ہندو مسلم فسادات سے معصموں اور بے گناہوں کا قتل عام ہورہا ہے لوگ اپنے گھروں سے بے گھر ہورہے ہیں اس میں افسانہ نگار کی سوچ وفکر کی جھلک بھی علامتی انداز میں قاری کے سامنے آتی ہے انھوں نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ نفرت، حسد، فرقہ پرستی کی خاتمہ کے لیے برف کی نئی چادر اُوڑھنی پڑے گی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا اُن بے سہاروں کی چیخیں اُن کے آنسوں جنہوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا اپنا گھر بار یہاں تک کہ اپنے پیاروں کی لاشوں کو اپنے ہاتھوں سے کفن دفن کر دیا آخر ایک مظلوم اور بے بس آدمی وہاں کیا کر سکتا جہاں ظالم ہزاروں کی تعداد میں ہو وہاں ایک امن کی آواز ان کے طاقت سے دب جاتی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کی موجودہ صورت حال سے کون واقف نہیں ۱۹۹۰ء سے مسلح شورش نے وادی میں زیادہ ہی تباہی مچھادی۔ جیسے کہ پچھلے باب میں بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ نویں کی دہائی میں وادی کشمیر میں عسکریت پسندی کا دور شروع ہوا۔ اس شورش زدہ ماحول نے جہاں ہر فرد کو متاثر کیا وہاں کشمیری پنڈت طبقہ خوف وہراس کا شکار ہوئے اسی تناظر میں کشمیر کی اقلیتی برادی ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ جس سے انہیں اجنبی وطن میں طرح طرح کے مشکالاتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جو کشمیری غیر مسلم افسانہ نگار وادی کے پُر آشوب دور سے گذر کر اپنے روایتی تہذیب وتمدن اور ثقافت کو ایک جانب چھوڑ کر اپنے آبائی وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ان افسانہ نگاروں میں ویریندر پٹواری، دیپک کنول، دیپک کنول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب ہم ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان تخلیق کاروں کی سوچ اور فکر اور ذہنی

رُخ بھی واضح طور پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ یعنی جو واقعات وقوع پذیر ہوئے ان سے وہ خود دوچار ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں اپنے آبائی وطن سے جدائی اور ہجرت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ان کا ہر افسانہ چیخ چیخ کر وادی گُلپوش کی بربادی کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ اکثر کشمیری پنڈت ادیبوں نے اپنی کہانیوں میں ہجرت کے اس الم ناک حادثے کو موضوع بحث بنا کر عالمِ انسانیت کے سامنے ایک سوال کھڑا کیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ہمیں اپنے ہی وطن میں رفیوجی کیوں بنانا پڑا؟ پھر چاہے انھوں اپنی مرضی سے یا حکومت کے بہکاوے میں آ کے یا عسکریت کے خوف سے اپنے آبائی وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے مگر اس کا براہِ راست تعلق وادی کے دہشت زدہ ماحول سے ہی ہے۔ لیکن انہیں اپنا آبائی وطن چھوڑنا نہایت اذیت ناک ثابت ہوا۔ وادی کشمیر کی پُر فضا موسم کے بدلے انہیں اجنبی وطن میں تپتی ہوئی آگ اور کارخانوں سے نکلتی ہوئی گرم ہوائیں ملی ایسے ماحول میں رہنا کسی جہنم سے کم نہ تھا۔ جب ہم ان کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ آج بھی اسی ماحول میں اور انہیں گھروں میں رہ رہے ہیں جنہیں وہ چالیس پچیس سال پہلے چھوڑ کے آئے تھے۔

حوالہ جات:

۱۔دیپک کنول،برف کی آگ(افسانوں کا مجموعہ)،(ممبئی:جواہر پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء)،ص۴۴۔

۲۔ایضاً،ص۴۷۔

۳۔ایضاً،ص۲۳۔

۴۔ایضاً،ص۲۴۔

۵۔شبنم قیوم،کشمیر میں عورتوں کی بے حرمتی،(سرینگر:وقار پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء)ص۱۰۱۔

۶۔دیپک کنول،برف کی آگ ،ص۷۷۔

۷۔ایضاً،ص۸۰۔

۸۔شبنم قیوم،کشمیر میں عورتوں کی بے حرمتی،ص۵۷۔

۹۔دیپک کنول،برف کی آگ،ص۶۵۔

۱۰۔ایضاً،ص۶۸۔

۱۱۔ایضاً،ص۱۴۔

۱۲۔سید علی گیلانی،ولر کنارے(جلد دوم)،(سرینگر:ملت پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء)ص۳۹۷۔

۱۳۔دیپک بدکی،زیبر اکراسنگ پر کھڑا آدمی(جلد دوم)،(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۸)ص۳۶۔

۱۴۔ایضاً،ص۱۰۶۔

۱۵۔ایضاً،ص۱۰۷۔

۱۶۔دیپک بدکی،چنار کے پنجے(افسانوں کا مجموعہ)(پہلا ایڈیشن،مجلد)،(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،۲۰۰۵ء)ص۵۰۔

۱۷۔ایضاً،ص۵۰۔

۱۸۔ایضاً، ص۵۱۔

۱۹۔ایضاً، ص۵۲۔

۲۰۔ایضاً، ص۷۶۔

۲۱۔ایضاً، ص۷۷۔

۲۲۔ایضاً، ص۷۹۔

۲۳۔وریندر پٹواری، لالہ رُخ (پچاس منتخب افسانوں کا مجموعہ)، (دہلی: آفسیٹ پرنٹرز، ۲۰۱۳ء) ص۷۹۔

۲۴۔ایضاً، ص۸۱۔

۲۵)۔ایضاً، ص۸۲۔

۲۶۔ایضاً، ص۵۹۔

۲۸۔ایضاً، ص۶۰۔

۲۸۔ایضاً، ص۵۵،

۲۹۔ایضاًص۵۶۔

۳۰۔ایضاً، ص۵۷۔

باب چہارم:

ہندو اور مسلم فکر کے تناظر میں ریاست جموں و کشمیر کی صورت حال کا جائزہ

ہر قوم کے افکار پر اس قوم کی تہذیب و ثقافت اور مذہب و سیاست کے گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ جموں و کشمیر کی اکثریت اگرچہ مسلم آبادی پر مشتمل ہے تاہم اس کے بعد سب سے بڑی اکثریت ہندو اور سکھ قوموں کی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ تینوں قوموں کے افکار میں تہذیبی و ثقافتی مماثلت تو ملتی ہے تاہم سیاسی اور مذہبی اثرات مختلف نوعیت کے ہیں جو کہ جموں و کشمیر کی صورت حال کا مجموعی خاکہ بن جاتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو وہاں کے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں بھی متنوع افکار کی عکاسی نظر آتی ہے۔ دونوں تخلیق کاروں کے افسانوں میں اگرچہ وہاں کی تہذیب و ثقافت کے مشترکہ عناصر کئی کئی یکساں نظر آتے ہیں۔ تاہم سیاسی اور مذہبی نظریات میں کافی فرق نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وادی میں ہر مسلک اور مذہب کے لوگوں کو اپنی طرز گردی اور ظلم و تشدد کا شکار ہو گئی چند شر پسند لوگ اقتدار اور بندوق کی نوک پر ہندو و مسلم کی بھائی چارگئی اور امن کو ٹھوس پہچانے میں پیش پیش رہے۔ اگر جموں و کشمیر کے سیاسی صورت حال پر نظر ڈالی جاے تو تاریخ کی اوراق گردانی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وادی کشمیر پر ہمیشہ اس کی خوب صورتی کی وجہ سے بیرونی حکمرانوں کی نظریں رہی ہیں خواہ وہ سکھ حکومت کا دور ہو یا ڈوگرہ زندگی گزارنے کے یکساں مواقع حاصل تھے۔ جموں و کشمیر کے حالات بگڑنے سے پہلے لوگوں کو ایک دوسرے کے مسلک اور مذہب پر ایک طرح کا بھائی چارہ اور ماحول بھی انتہائی پُر سکون تھا۔ وادی گُلپوش کی مہمان نوازی اور بھائی چارگی کی مثال پوری دنیا میں مشہور ہے وہاں ہندو مسلم سکھ عیسائی ہر مسلک کے لوگ آپس میں اس طرح رہتے تھے بعض جگہوں پر یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ کون کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ جموں و کشمیر میں فرقہ وارانہ فسادات کا دور دور تک تصور نہیں ملتا تھا وہاں کے لوگ دوسرے مذہبوں کی لڑکیوں، ماں، بہنوں کی عزت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کی نویں دہائی میں جنت نما وادی دہشت دور ہو۔ جو افسانہ نگار مل جل ڈوگرہ حکومت کی ڈھائی گئے مظالم کے خلاف لکھ رہے تھے لیکن آج کی موجودہ جمہوری دور نے نہ صرف فرقہ پرستی کی ہوا کو کھڑا کر دیا بلکہ معاصر افسانہ نگاروں کو دو الگ الگ گرہوں میں بانٹ دیا۔ ایک گرہ کو مجبوراً وادی چھوڑ کر جموں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زندگی گزارنے لگے اور دوسرا گروہ وادی کشمیر میں ہو رہے ظلم و ستم کو برداشت کر کے اپنے اپنے دُکھ سکھ کو افسانوں میں قید کرتے گیے۔

زیر نظر باب میں ہندو اور مسلم افسانہ نگاروں کے فکری مطالعہ پیش نظر ہو گا اس لیے معاصر ہندو اور مسلم ادباء کے تخلیقات پر فکری رجحانات پر بحث کرنے سے قبل ریاست جموں و کشمیر کی تاریخی اعتبار سے بھی تھوڑی سی روشنی ڈالنا مناسب سمجھتی ہوں۔ دراصل برصغیر کے تقسیم کے وقت تمام ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ پاکستان یا بھارت کے ساتھ کسی ایک ملک سے الحاق کر لیں یا اپنی آزاد حثیت برقرار رکھیں۔ اسی طرح ریاست جموں و کشمیر کے مہارجہ ہری سنگھ کو اس فصلے کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ دونوں ممالک ہندو پاک میں کسی ایک ملک کے ساتھ الحاق کریں، چونکہ کشمیر مسلم اکثریتی ریاست تھی اس لیے ریاست جموں و کشمیر کے مہارجہ ہری سنگھ کے ساتھ اول مراحل میں پاکستان نے الحاق کے معاملے میں رابطہ کیا۔ مہارجہ نے غیر رسمی طور پر اس اقدام کا خیر مقدم کیا لیکن تحریری معاہدہ نہیں ہو پایا۔ اسی دوران قبائیلوں نے وادی کشمیر کے بہت سے علاقوں پر مہارجہ کا قبضہ ختم کر کے پاکستان کے زیر انتظام دے دیے۔ اس کے بعد اقوام متحدہ نے جنگ بندی کا آعلان کیا نتیجے میں ریاست جموں و کشمیر کے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اسی دوران بھارت کے حکمرانوں نے مہارجہ سے رابطہ قائم کیا۔ اکثر مورخین اس بات کو رقم کرتے ہیں کہ مہارجہ نے ہندوستان کے ساتھ الحاق اس کے بعد دونوں ممالک میں جنگ کا آغاز ہو گیا۔ چونکہ وادی کشمیر کی کثیر آبادی مسلمانوں پر مبنی ہے۔

اس لیے یا تو وہ خود مختار رہنا چاہتے تھے یا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس معاملے کو لے کر وادی میں وقتاً فوقتاً آوازیں بلند ہوئیں لیکن ۱۹۹۰ء کی شروعات میں کشمیر کی تحریک آزادی کا نیا جنم ہوا اور اس تحریک آزادی میں پہلی بار عسکریت شامل ہو گئی وہاں سے ہی سیاسی و سماجی، تہذیبی و ثقافتی منظر نامے میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ سطح جدوجہد میں ہزاروں لاکھوں کشمیری نوجوانوں نے بھارت کے خلاف سینہ سپیر ہو کر وادی کی تحریک آزادی کے لیے جانیں قربان کر دیں۔ دیگر طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد خاص طور پر کشمیری ہندو پنڈتوں کو گورنر جگمو ہن نے ایک خاص منصوبے پلان کے تحت وطن چھوڑنے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے وہ جموں اور ہندوستان کے مختلف علاوقوں میں پناہ گزینوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ غرض ریاست جموں و کشمیر میں پچھلے کئی برسوں سے وسیع پیمانے پر جاری سرکاری ظلم و جبر، مار پیٹ، لوٹ مار اور قتل و غارت گری اور اس کی مزاحمت میں چلنے والی عسکری اور پُر امن دونوں اقسام کی عوامی جدوجہد سے وادی میں رہنے والا ہر طبقہ متاثر ہوا یہ مسئلہ عام لوگوں کے ساتھ تخلیق کاروں کے ساتھ بھی پیش آیا ۔اس نازک صورت حال نے وہاں کے ادیبوں کا رُخ ہی تبدیل کر کے رکھا خواہ وہ سیاسی تبدیلی ہو یا سماجی اس پُر آشوب دور میں بھی کچھ ایسے تخلیق اُٹھے جنہوں نے کشمیر کے مظلوم عوام کی جذبات و احساسات کی کھل کر ترجمانی کی ہے۔ اس تناظر میں جب ہم ریاست جموں و کشمیر کے معاصر ہندو اور مسلم افسانہ نگاروں کے وادی کی موجودہ صورت حال کے حوالے سے

ان کے تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وادی کشمیر گزشتہ تین دہائیوں سے جس آگ میں جھلس رہی ہے کشمیر کا ایک طبقہ اس تحریک کو جنگ آزادی سے منسوب کرتا ہے لیکن دوسرا طبقہ اس تحریک کو دہشت گردی سے جوڑتا ہے۔ جب ہم وادی کشمیر کے مسلم افسانہ نگاروں کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنا احتجاج افسانوں کی صورت میں پیش کیا۔ اگر ہم ان کے افسانوی ادب کو انسانی حقوق کے پامالیوں کے خلاف ایک احتجاج و مزاحمت مان لیں تو مبالغہ نہ ہوگا وادی کشمیر کے افسانوی ادب پر جو رُمانوی فضا چھائی ہوئی تھی اس کی چاسنی اس وقت ختم ہو گی جب وادی کشمیر بیسویں صدی کی نویں دہائی میں دہشت گردی اور ظلم و تشدد کی لپیٹ میں آگئی جس کی وجہ سے وادی گُلپوش کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا بے قصوروں اور نہتے لوگوں کا استحصال، معصوم لوگوں کا قتل عام، بھا دھاکوں لگاتار چلتی گولیوں اور فرقہ وارانہ وارداتوں کی سلگتی ہوئی آگ، گمشدگی، دہشت گردی جیسی ڈروانی صورت حال اُس وقت قاری کی سوچ پر چھا جاتی ہے جب وہ ریاست جموں و کشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ دہشت گردانہ ماحول کی نذر نہ جانے کتنے معصوم اور عام شہری ہو چکے ہیں اور ان کے عزیز و اقارب ان کی یاد میں خون کے آنسوں بہاتے رہتے ہے اور وہ برسوں سے انصاف گھروں کے دروازے کھٹکٹار ہے ہیں کہ شاید وہاں سے ان کے گمشدہ نواجونوں کی واپسی کی کسی خوش خبری کا اعلان ہو جائے اس دل دہلانے والے مسئلے کی عکاسی افسانہ "بے زمینی کا کرب" میں نور شاہ نے اس درد و کرب کو بڑی خوب صورت پیرایہ میں پیش کیا ہے یہ ایک ایسی خوف ناک داستان ہے جو خون آہوں اور سسکیوں سے عبارت ہے جو جموں و کشمیر کے طول عرض میں بکھری ہوئی ہے۔ یہ کہانی کشمیر کے ان ہزاروں بے بس والدین کی بد نصیبی کی کہانی ایک معصوم طالب علم امجد کے کردار کے ذریعے بیان کی گئی ہے جو انڈین آرمی کے ظلم و تشدد کا شکار ہو کر بے نام قبر میں ہمیشہ کے دفن ہو چکے ہیں اور پڑھاپے کے سہارے کو یہ ظالم ختم کر کے نا جانے کتنے والدین کی پوری عمر کے لیے صدمہ بنا دیتے ہیں۔ اس کہانی میں پوری وادی گُلپوش کا درد پوشیدہ ہے یہ درد اب ہر کشمیری کے زندگی کا حصہ بنا ہوا ہے۔ اس طرح کے اشارے ہمیں شبنم قیوم کا افسانہ "حالات کے ٹھپڑے" میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس کہانی میں افسانہ نگار نے وادی کشمیر کی تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے کہ وادی کشمیر کی ظلم و ستم کی انتہا اس قدر بڑھ گئی ہے کہ والدین کے سامنے بغیر کسی جرم اور خطا کے مارتے پیٹتے اور پھر گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے جا کر غائب کرتے ہیں۔ اس کہانی کے کردار منیر اور نصیر نہ صرف اس کڑوے سچ کی علامت ہے بلکہ یہ اُن سینکڑوں معصوم کشمیریوں کے خون ناحق کی بھی علامت ہیں جنہیں ظالم حکمرانوں نے بے نام قبروں میں ہمیشہ کے لیے سُلا دیا کیوں کہ قابض فوج کو کالے قوانین کا سہارا دیا گیا اس لیے وہ اپنی رٹ قائم کرنے کی خاطر کشمیریوں کی آواز کو دبانے کے لیے ظلم و ستم کے نئے ہتھکنڈے ایجاد کیے گئے:

ورنڈے میں دو ہٹے کٹے جوانوں کو دیکھ کر فوجی جوان ان پر ٹوٹ پڑے ان کو دبوچ لیا گیا۔ نہ کچھ سنا نہ کچھ بولا بس مارتے پیٹتے رہے اور پھر گھسیٹے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے؟ کہاں اور کدھر، کئی کوئی پتہ نہ چل سکا۔[1]

جس طرح امن وامان کی خراب صورت حال نے مسلم افسانہ نگاروں کو متاثر کیا اسی طرح وادی کشمیر کے غیر مسلم افسانہ نگار اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔ انہوں نے بھی وادی کُلپوش کی موجودہ صورت حال کو اپنا موضوع بنایا اور اپنی تخلیقات پیش کیں۔ وادی کشمیر کی موجودہ صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے دونوں فرقوں کے افسانہ نگاروں مسلم اور کچھ غیر مسلم افسانہ نگاروں کی سوچ وفکر اور نظریات میں یکسانیت کا نقطہ ان کے کچھ تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح وادی کا ایک غیر مسلم کہانی کار اور حساس ذہن رکھنے والا صاحب نظر اور اپنے سینے کے اندر درد دل رکھنے والا قلم کار وریندر پٹواری ہے ان کے گرد و نوح میں لوگوں کو جس ظلم و تشدد سے گزرنا پڑھ رہا ہے اس کی تصویریں وریندر پٹواری اپنے افسانوں میں پورے خلوص، درد مندی اور دکھ کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس کی مثال ہمیں ان کے افسانہ "دستک" سے ملتی ہے۔ اس کہانی میں افسانہ نگار نے خالدہ کے کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وادی میں بیشتر بے بس اور لاچار مائیں ایسی ہے جن کی کوکھ ہی اجڑ چکی ہے اولادیں جننے کے باوجود وہ اپنے لخت جگروں کی ایک جھلک دیکھنے کو تڑپ رہیں ہیں۔ اولادوں کی جدائی میں ان کا ایک ایک پل درد اور تڑپ میں گزرتا ہے۔ ہر آہٹ اور آواز پر کشمیری مائیں چونک پڑتی ہے کہ شاید ان کے لخت جگر وآپس آگئے۔ جس طرح افسانے کا کردار خالدہ کے گھر کے دروازے پر جب دستک ہوئی تو خالدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں دیکھتی رہی جیسے ان کا بیٹا مشتاق گھر لوٹ آیا ہو:

> لیکن جب اُس شخص نے چہرے سے نقاب اُٹھایا تو خالدہ نے اپنے شوہر کے سب سے پیارے اور ہون ہار شاگرد اشتیاق کو فوراً پہچان لیا۔ کیوں کہ یہی وہ لڑکا تھا جو جرمنی سے لوٹ کر امیر باپ کے کاروبار کو فروغ دینے کے بجائے خالدہ کے شوہر سے کشمیری صوفیانہ موسیقی سیکھ رہا تھا۔ مگر آج اس کے کندھے پر ان کے من پسند ساز سارینگی کے بجائے بندق دیکھ کر خالدہ خوف زدہ ہو گی۔[2]

ان سطروں میں وریندر پٹواری نے ان حالات وواقعات کی عکاسی کی ہے جن سے ہر کشمیری دوچار ہے۔ افسانہ نگار نے اشتیاق کے کردار کے ذریعے ان نوجوانوں کی عکاسی کی ہے جنہوں نے تعلم حاصل کی اچھا ہنر سیکھا لیکن وادی کے کرب ریزی نے نہ جانے کتنے نوجوانوں کو اشتیاق جیسا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا کشمیری والدین اپنے بچوں کی حصول تعلیم کے لیے اپنے بچوں کو وادی کے دہشت زدہ ماحول اور بندوق کے بغیر ان کا ہنر اور پُر وقار مستقبل بنانا چاہتے ہیں مگر ان کے بچوں کی تعلیم کشمیر کے دشمنوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی جو نہ صرف ان کو علم کی دولت سے محروم کر رہے ہیں بلکہ ان کو زندگی سے

بھی محروم ہونے کے لیے بندوق اُٹھانے پر مجبور کرتے ہیں۔اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح وادی کشمیر میں ہر جانب گلوں کو کچلا جارہا ہے۔کتنے پھول ایسے ہیں جو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے ہیں ہر طرف مایوسی اور اُداسی چھائی ہوئی ہے۔

کے کچھ غیر مسلم افسانہ نگار ایسے ہیں جنھوں نے اپنے گردو پیش کے حالات کو یکسر نظر انداز کر لیا ہے۔اپنے ارد گرد کے خون آشام حالات سے جموں وکشمیر کے ادیبوں کی طرف یہ بے اعتنائی کی وجہ شاید ان تخلیق کاروں کی سرکاری انعام اور ایواڑ کے حصول کے خاطر اپنی تحریروں اور کہانیوں کو سرکاری بیانیے کے مطابق ڈھالتے ہیں۔یہ افسانے ادیبوں کی جانبداری کا پروپگنڈہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔وادی کا غیر مسلم افسانہ نگار دیپک کنول نے وادی کشمیر کی تحریک آزادی کو دہشت گردی سے جوڑ کر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ تحریک آزادی نہیں بلکہ دہشت گردی کی تحریک ہے ۔چونکہ افسانہ نگار خود ایک ہندو ہے اس لیے یک طرفہ بول کر اصل مجرم کی پہچان کرانے بجاے اُلٹا سرحد پار الزام لگایا ہے کہ یہ جدوجہد کشمیریوں کی جدوجہد نہیں ہیں بلکہ سرحد دہشت گردی ہے اور اس کی پشت پر پاکستان ہے اور یہ سب کچھ پاکستان کروا رہا ہے:

> جب سے وہ سرحد پار سے لوٹا تھا۔ایک آدھ بار وہ گھر والوں سے ملنے گیا تھا۔۔۔۔اس کے باپ نے اس سے لاکھ سمجھایا۔اس کے سامنے رویا گڑگڑایا کہ وہ بربادی کا راستہ چھوڑ کے پھر سے شریفوں کی زندگی بسر کرے مگر گل گرینیڈ پہ باپ کی باتوں کا ذرا سا بھی اثر نہ ہوا۔۳

وادی کشمیر کا ایک اہم مسئلہ کشمیری پنڈتوں کی نقل مکانی ہیں۔جب وادی کشمیر میں ۱۹۹۰ء میں عسکری تحریک کا آغاز ہوا تو اُس وقت گورنر جگموہن نے ایک منصوبہ پلان کے تحت کشمیری پنڈتوں کو اپنے آبائی وطن چھوڑنے پر مجبور کیا ۔ہجرت کے کرب کا اظہار اکثر ان ادیبوں نے کیا ہے جن کو اپنی جنم بھومی سے زبردستی سیاسی دباؤ کے تحت جدا کر دیا گیا۔وہ اپنے احساس مہاجرات کے ساتھ اجنبی دیس اور اجنبی لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔وادی کشمیر کے غیر مسلم افسانہ نگار وادی کے نامساعد حالات سے گزر کر اپنے روایتی تہذیب وتمدن کو ایک جانب چھوڑ کر وادی گُلپوش سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے ان کے اکثر افسانوں میں کشمیری پنڈتوں کی دربدری اور بے گھری کا دُکھ درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔انہوں نے ہجرت کے اس دردناک واقعہ کو موضوع بحث بنا کر عالم انسانیت کے سامنے ایک سوال کھڑا کیا۔سوال آخر انہیں اپنے ہی آبائی وطن میں رفیوجی کیوں بنا پڑا۔؟اسی نوعیت کے دیپک بدکی کے افسانے "زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی" اور "گونسلہ" کا موضوع کشمیری پنڈتوں کی نکل مکانی اور جموں میں آئے دن مشکلات اور حادثات کی روداد کو قلم بند کیا ہے۔افسانہ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی" ایک ایسے بوڑھے کسان کی کہانی ہے جو وادی گُلپوش سے ہجرت کرنے کے بعد نہ

صرف مالی حالات کا شکار ہوا بلکہ انہوں نے اس اجنبی شہر کی روڈ کراسنگ پر اپنا جوان بیٹا بھی کھو دیا جو اس کے بڑھاپے کا آخری سہارا تھا۔ آج یہ بوڈھا کسان بھی مسلسل ایک گھنٹے سے اس اجنبی شہر کی زیبرا کراسنگ پر روڈ پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس پرائے شہر میں گاڑیوں کی اتنی آمد و رفت تھی کہ روکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اس نے کئی دفعہ روڈ پار کرنے کی کوشش کی تھی مگر اُس سے اپنے بیٹے کی موت بار بار خوف زدہ کر رہا تھا۔ بوڈھے کسان کو اپنے گھر کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح احساس تھا اس لے وہ اپنے بیٹے کی طرح کسی حادثے کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ان کے پاس جو کچھ بھی مال واسباب تھا وہ سب اپنے شہر مین چھوڑ کر اپنے بال بچوں کو زندگی بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ ان کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا اس لے بوڈھا کسان اجنبی شہر میں مجبور تھا اس کو توریلیف حاصل کرنے کے لیے دس کلومیٹر دور جانا ہی تھا۔ ان کو اجنبی شہر میں حصول رزق کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اپنے وطن کی یاد ستاتی ہے اور اس کا ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتا ہے اور ان کے دل پر عجیب سی بے چینی اور قلق کا عالم تھا:

> میرے آبائی وطن میں اناج کے انبار لگے رہتے تھے اور کہاں یہ کسمپرسی اُدھر گاؤں میں ہر روز دو آدمیوں کے لیے فالتو کھانا پکتا تھا۔۔۔ جب بھی کوئی بن بلایا مہمان آجاتا دستر خوان بچھانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی اب سارا کنبہ دانے دانے کا محتاج ہو چکا تھا۔[۴]

دیپک بد کی نے مہاجرین کے اس دکھ درد کو بڑی خوب صورتی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چونکہ افسانہ نگار خود ایک مہاجر ہے اس لیے انہیں مہاجروں کے مسائل کا بخوبی اندازہ ہے کہ کشمیری پنڈتوں کو جب اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی تو انہیں طرح طرح کے مسائل ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ان لوگوں کو جن کو پُر آشوب دور سے گزرنا اس کی وجہ سے یہ لوگ ذہنی طور پر لاغر ہو گئے اور ان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں بھی ختم ہو گئی ہیں۔ جس طرح افسانے کا مرکزی کردار بوڈھے کسان کو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ روڑ کیسے پار کروں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک انسان کو ایک دھرتی سے دوسری دھرتی پر آباد ہونا صرف بے زمینی ہی کو اُجاگر نہیں کرتا بلکہ وہ انسان اپنے دیش کی پوری تہذیب وتمدون ،روایات سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کشمیری ہندوؤں پنڈتوں کے لیے جموں ایک اجنبی وطن تھا وہاں کی تہذیب وتمدن وادی گُلپوش کی تہذیب وتمدن سے بالکل مختلف ہے۔ انہیں وادی کشمیر کی پُر فضا موسم کے بدلے وہاں انہیں سورج کی تپتی ہوئی آگ اور کارخانوں سے نکلتی ہوئی گرم ہوائیں۔ ایسے ماحول میں ان کا وہاں رہنا کسی جہنم سے کم نہ تھا وہ آج بھی ذہنی طور انہیں گھروں اور اسی ماحول میں رہ رہے ہیں جنہیں وہ پچیس سال پہلے آلودع کہہ کے آئے تھے۔

وادی کے کچھ غیر مسلم مہاجر افسانہ نگار ایسے ہیں جنہوں نے اکثر کہانیوں میں جانبداری کا مظاہرہ کر کے کشمیری ہندوؤں پنڈتوں کی ہجرت کو غلط رنگ دے کر کشمیری مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھرایا ہے جس کی مثال ہمیں دیپک کنول کا

افسانہ "سچ بولنا منع ہے" میں ملتی ہے۔انہوں نے قادر شاہ اور ایک اجنبی شخص کے کردار کے ذریعے وادی کشمیر کے حریت پسندوں اور وہاں کے عام کشمیریوں کے خلاف زہر اگلا ہے کہ حریت پسند اپنے مفادات کے خاطر صرف خوں خرابہ کرنا جانتی ہیں ان ہی کے ہاتھوں کشمیری ہندوؤں پنڈتوں کا قتل ہوا، ان کی جائدادیں لوٹ لی گئی، انہوں نے کشمیری پنڈتوں کو گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کیا۔ چونکہ افسانہ نگار خود ایک ہندو ہے اس لیے افسانہ نگار نے مذہب کو بنیاد بنا کر حقیقت سے مُنہ موڑ کر جھوٹ کا پلندہ کھڑا کیا۔ حالانکہ اگر اس افسانے کا وادی کشمیر کی تاریخی حقائق کا دیانتدارانہ تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو حقیقت اس کے برعکس ہیں۔ حقیقت یہ ہے جب وادی جب وادی کشمیر میں عسکری تحریک کا دور شروع تو فوسز کو کشمیریون کے ساتھ ظلم وزیادتی، لوٹ مار، بستیوں کی مسماری، گھروں کی آتش زانی، نوجوان پود کی نسل کشی، عزت وعصمت کے ساتھ کھلواڑ کرنے کی صوفی صد آزادی دی گئی۔ اس مظالم کے خلاف جب عام کشمیری مساجد کے لاوڑ سپیکروں کے ذریعے نعرہ بازی کرتے تھے تو وہ نفسیاتی طور پر ہراساں تھے کیوں کہ ان بے بس اور مظلوم لوگوں کے پاس نعروں اور شور وغل کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن کشمیری مہاجر ہندوؤں پنڈتوں کا یہ استدلال کہ یہی وجہ ان کو وادی چھوڑنے کا بنیادی سبب بنا تو یہ بہت بڑا فسانہ طرازی ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وادی کشمیر کی عسکری تحریک شروع ہوتے ہی جہاں ہر روز پچاس سے سو مسلمانوں کو سرکاری فوج اور اجنسیوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر دیا تھا تو وہاں ہندوؤں برادری افراد بھی اس افراتفری کے ماحول میں کہیں فوج تو کئی جنگجوؤں کے ہاتھوں کام آگئے۔ لیکن اس کی ذمہ داری خالی مسلمانوں پر عائد کرنا درست نہیں ہے۔

وادی کشمیر کے مسلم افسانہ نگاروں نے ہجرت اور فساد کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاف اور ہجرت پر بھی روشنی ڈالی، یہ قتل وغارت، لوٹ مار اس سرزمین پر ہو رہی ہے جو کبھی صلح وآتشی اور چین وسکون کا گہوارہ تھی وادی کشمیر نہ صرف قدرتی حُسن وجمال کی سے پہچانا جاتا ہے بلکہ وہاں کے لوگوں کی تہذیب وتمدن بھی اپنا ایک الگ اور اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ وادی کشمیر کی بھائی چارگی کی مثال پوری دنیا میں مشہور ہے وہاں کے ہندو، مسلم، سکھ عیسائی ہر مسلک کے لوگ آپس میں اس طرح رہتے تھے کہ بعض جگہوں پر یہ اندزہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ کون کس مسلک سے تعلق رکھتا ہے۔ وادی کشمیر میں فرقہ وارانہ فسادات کا تصور دور دور تک نہیں ملتا تھا وہاں کبھی دنگے فساد نہیں ہوتے تھے لیکن نویں کے دہائی کے بعد حالات کچھ اس طرح بدل گئے چند سر پسند اقتدار اور بندوق کے نوک پر اس بھائی چارگی اور امن کو ختم کرنے میں پیش پیش رہے یہ المناک سیاسی حادثہ تھا اس لیے معاصر افسانہ نگاروں کے ہاں اخوت اور محبت کے رشتوں کا ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل دکھائی دیتا ہے جس کی مثال ہمیں مسلم افسانہ نگار ڈاکٹر ریاض توحیدی کا افسانہ "ہوم لینڈ" میں نظر

آتا ہے۔اس کہانی کے تین کردار تین الگ الگ فرقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔افسانہ نگار نے جُرت مندی کے ساتھ قوم کے حقائق اور مسائل کا تجزیہ افسانے میں پیش کیا ہے اس کہانی میں افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وادی کشمیر میں رہنے والے، مسلمانوں، ہندوؤں اور سیکھوں کے درمیان صدیوں سے چلے آرہے بھائی چارہ کو کیسے اور کن سازشیوں کا شکار ہونا پڑا۔ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اُس وقت کے سیاست دانوں چہرہ بے نقاب کیا جنہوں نے اپنے اقتدار کے خاطر سینکڑوں سال پرانی مشترکہ تہذیب اور مسلم فضا اور بھائی چارگی کو ختم کر دیا۔افسانہ نگار نے کرداروں کے ذریعے قارئین تک یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ کشمیریوں نے کبھی اقلیت کو اقلیت نہیں سمجھا بلکہ ان لوگوں کو ہمیشہ کشمیریوں مسلمانوں نے اپنے عزیزوں اور پیاروں سے بڑھ کر محبت دی مگر جب وادی کشمیر کے حالات بگڑ گئے اُس وقت ان کا ساتھ دینے کے بجائے خود ساختہ لیڈروں کے بہکائے میں اکر کشمیر چھوڑ کر جموں اور ہندوستان کے مختلف شہروں کی طرف نکال مکانی کرنے کو ہی ترجیح دی۔افسانہ نگار نے نہایت ہنرمندی اور بے باکی سے کئی حقیقتوں کو سامنے لانے کی کوشش کی کے کہ جب بھی کشمیری لوگوں پر کوئی مصیبت آن پڑی ا۔اُس وقت اقلیت اکثریت کے ہم قدم نہیں تھیں بلکہ انہوں نے اپنی جان بچانے کے لیے صدیوں کے بھائی چارے کو ختم ردیا اور آرام کی زندگی گزارنے کے لیے انہوں نے خود اپنی زمین وجائداد کا سودا کیا اور پھر خود ساختہ لیڈروں کی بولی بول کر کشمیری مسلمانوں پر الزام لگایا کہ ان لوگوں نے ہمیں گھر سے بے گھر کیا:

> تم لوگ اپنی جنم بھومی کو دھوکہ دے کر صدیوں کے بھائی چارے کو توڑ کر یہاں سے فرار ہوئے ہو، تم لوگوں نے خود اپنے مکان جلوائے اور اپنی زمین ہمیں بیچ ڈالیں تم لوگوں نے اس دھرتی کو دھوکہ دیا۔۵

مزید افسانہ نگار نے زیر نظر افسانے میں سکھ فرقہ کے کردار سردار سرجیت سنگھ کے ذریعے ایک اہم سوال اُٹھایا کہ اگر وادی کشمیر کی اکثریتی آبادی کی طرف سے کشمیری ہندوؤں پنڈتوں کو خطرات اور دھمکیوں کا سامنا تھا تو کشمیری سکھوں کو کس نے کہا کہ کشمیر کی تحریک آزادی کا ساتھ دو یا کشمیر چھوڑ دو؟ وہ اپنی دھرتی پر آرام سے قیام پذیر رہے تو کس نے ان کے ساتھ چھڑ چھاڑ کی؟ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر کی مزاحمتی تحریک آزادی کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر دنیا کے سامنے سچائی کی اصل تصویر پیش کرانے کے بجائے یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وادی کے مسلمان ہندو پنڈتوں آبادی کو اپنے گھروں سے بے گھر کر رہے ہیں۔اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ کھیل ہندو انتہا پسندوں نے کھیلا اور کشمیری ہندوؤں پنڈتوں کو گھر سے بے گھر کر کے انہیں رفوجی بنا دیا۔

اس طرح کی نشان دہی نور شاہ نے افسانہ "مجروح قافلے کی داستان" میں دو علامتی کردار ابابیل اور باز کے کردار کے ذریعے کشمیر کے سلگتی ہوئی وادی میں ہونے والی حقوق کی پامالیوں کو پس منظر بنا کر وادی گُلپوش کی تاریخ کو اس کہانی میں قید کر لیا ہے۔۱۹۴۷ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں حالات کافی خراب رہے خاص کر ۱۹۹۰ء کے بعد ریاست میں جو

افراتفری اور بدامنی چاروں طرف پھیل گئی۔ برصغیر کے تقسیم کے ساتھ ساتھ ریاست جموں وکشمیر بھی تقسیم ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور اس تقسیم سے لوگ اپنے ہی وطن میں خانہ بدوشوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔

بے راہ روی دور حاضر کا مقدور ہے۔ آج کے دور کا انسان بے رحم اور ظالم بن چکا ہے۔ ایک دوسرے سے سبقت لینے کے لیے انسان اپنے جذبات سے بھی عاری بن جاتا ہے۔ سچ اور جھوٹ کو غلط ملط کر کے انسان زندہ لاشوں کی طرح رہ گئے ہیں۔ اس بے راہ روی کے دور میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو سچ کو تھامے رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن مکار اور عیار لوگ انہیں اس فعل میں روکاوٹ بنتے ہیں۔ وہ ان کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ سچے اور مخلص لوگوں کے حقوق چھین لیتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ بے یار و مددگار بن جاتے ہیں۔ طاقتور سارے وسائل پر اپنا قبضہ جما لیتے ہیں اور عام لوگ بس تماشا بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے ہی سنگین انسانی حقوق کی پامالی کا مسئلہ نور شاہ نے اپنی کہانی "مجروح قافلے کی داستان" میں اُبھارا ہے۔ جب ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بھارت نے طاقت کے نشے میں جموں وکشمیر پر غیر قانونی اور جبری قبضہ جما لیا اور تب سے وردی پوش نہتے کشمیریوں کا قتلِ عام کر رہی ہے، ان کے گھروں کو بارود سے اُڑا رہی ہے اور ان کے بنیادی اور انسانی حقوق کو پاؤں تلے روندھا جا رہا ہے۔ جس کشمیر کو دنیا میں جنت بے نظیر کہا گیا جس کی بیش بہا خوب صورتی کو دیکھ کر بالکل ایسا گماں ہوتا ہے جیسے دنیا میں جنت کا ٹکڑا اُتر آیا ہو۔ لیکن راکششوں نے طاقت کے بل پر مظلوموں کی آواز کو دبا کر اپنا جابرانہ قبضہ کر کے ان کے گھروں کو مسمار کر کے جنت نما کشمیر کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا یعنی وادی کشمیر کے لوگ ہمیشہ ہی ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے ہیں اور اس طرح جنت کا حسین ٹکڑا جلادوں کے شکنجہ میں گھرا ہوا ہے:

> جب باز نے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور پھر دیکھتے دیکھتے بہت سارے باز اُڑتے اُڑتے سامنے آ گئے۔ ایک عجیب سا شور و غل سنائی دینے لگا۔ ان کی آنکھوں میں دہشت تھی، بھوک تھی، ہوس تھی اور ان کی تعداد شاید ابابیلوں کی تعداد سے زیادہ تھی۔ ابابلیں ڈر گیں سہم گئیں لرز گئیں اور تھر تھرا گئیں۔۔۔۔ اور پھر بھیگی بھیگی آنکھوں سے ایک ایک کر کے وہاں سے چل پڑیں۔[۶]

وادی کشمیر کے افسانوی ادب کا ایک اہم موضوع عورتوں کے مسائل، خوف و ہراس، رنج و غم عصمت ریزی اور ذہنی و نفسیاتی کیفیات کی عکاسی کرتے نظر آ رہے ہیں۔ وادی کشمیر پچھلے کئی دہائیوں سے انسانی حقوق کی پامالی، سماجی عدم مساوات، سیاسی و سماجی افراتفری کی نتیجے میں سخت بحران پیدا ہو گیا ہے۔ مسلسل پُر آشوب حالات نے پوری وادی میں بے سکونی و اضطرابی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس شورش زدہ دور نے جہاں ہر کشمیری کو متاثر کیا وہاں سب سے زیادہ نقصان کشمیری خواتین نے اُٹھایا ہیں۔ ایک تو ان کے آنکھوں کے سامنے ان کے بھائی، باپ اور بیٹوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے یہ زخم تو ایسے ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ کبھی نہ کبھی بھر جاتے ہیں کیوں کہ مرنا تو زندگی کی حقیقت ہے۔ لیکن اس ذات پر

جو عظیم دُکھ ہو رہا ہے وہ ان کے عصمتوں کا لٹنے کا ڈر اور جنسی استحصال کا خوف ہوتا ہے تو دوسری طرف اپنے بچوں کے لیے فکر مند رہتی ہے۔وادی کشمیر کی امن وامان کی خراب صورت حال میں عورتوں پر ڈھائے گئے مظالم کو وادی کے معاصر افسانہ نگاروں موثر طریقے سے اپنی تحریروں کا حصّہ بنایا ہے جس کی مثال مسلم افسانہ نگار ڈاکٹر ریاض کے افسانے "وطن کی عصمت اور ٹوٹتی جوانیاں" میں نظر آتی ہے۔افسانہ "ٹوٹتی جوانیاں" وادی کشمیر میں خواتین پر ہو رہے ظلم وستم کی عکاس ہے۔اس کہانی میں افسانہ نگار نے وادی کشمیر کے ایک ایسے گاؤں کا حقیقی،،تاریخی واقعہ بیان کیا ہے جو انڈین آرمی کے ظلم وبربریت کا شکار ہوئے ہیں۔یہ کہانی اُس بھیانک رات کی وہ داستان ہے جب وادی کشمیر کے کنن پوش پورہ گاؤں میں تلاشی اور تفتیشی کاروائی کے دوران فوجیوں نے بڑے پیانے پر خواتین کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کی گئی۔آبروریزی کی اس کاروئی میں عمر کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا دس سال بچیوں سے لے کر ۸۰ سالہ بوڑھی عورتوں کو بھی اپنے ہوس کا نشانہ بنایا گیا ہے:

> پچھلے بیس برسوں سے گاؤں میں کسی بھی لڑکی کی ڈولی نہیں اُٹھی کیوں کہ گلستان کے دلیر پاسپانوں نے ان کی عزت لوٹ کر جو سیاہ دھبے ان کے پاک دامن پر لگادئے زمانہ کی گردش نے ابھی تک وہ صاف نہیں کئے۔ ے

مذکورہ اقتباس میں افسانہ نگار نے تاریخ کے اُن لمحات اور حالات و واقعات کو قید کیا جن سے ہر ی کشمیری واقف ہے اور یہ ایسی تلخ حقیقت ہے جو وادی کشمیر کے تاریخ پناؤں میں کبھی مسخ نہیں ہوسکتی ہے۔اس کہانی میں چھپے شدید درد وکرب کو محسوس کیا جاسکتا ہے نیز پُر آشوب حالات نے کشمیری خواتین کے ذہن پر مرتب ہونے اثرات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔وادی گُلپوش میں ہزاروں خواتین ایسی ہیں جنہیں آج تک انصاف نہیں ملا۔انہیں طاقت کے بل پر ڈرایا دھمکایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی ہونٹ سی لیتے ہیں وہ اپنا غم ظاہر کرنے کے بجائے خاموش رہ کر زہر کے تلخ گھونٹ پیتے رہے ہیں۔وادی کشمیر میں کئی جگہوں پر خواتین اپنی زندگیوں سے کھیل کر بھارتی فوجیوں جوانوں کے چنگل میں پھسنے کے بجائے موت کو ترجیحی دے رہے ہیں اور حکومت تمشائی بن کر اپنے اقتدار کے خاطر مجرموں کو سزا دینے کے بجائے اُلٹا بنت کشمیر پر ہی چھوٹے کیس دائر کرکے آئے روز ان کی آواز کو دبایا جارہا ہے۔کشمیری مائیں آج بھی جب ۱۹۹۱ء میں کشمیریوں خواتین سے اجتماعی آبروریزی کے واقعات کو بیان کرتی ہیں تو سن کے اور تاریخ کے پناؤں ان وواقعات کو پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔زمانہ قدیم سے ہی خوف ودہشت کو جاری رکھنے کے لیے عورتوں کو ہمیشہ جنسی تشدد کا سہارا لیا جاتا رہا ہے۔مختلف حالات میں خواتین بطور ہتھیار استعمال کی جاتی رہی ہیں۔اسی طرح وادی کشمیر میں آزادی کی آواز کو دبانے کے لیے،خوف اور دہشت کو جاری رکھنے کے لیے کشمیری خواتین کے جنسی تشدد کو وردی پوش بطور ہتھیار استعمال کرنے لگی۔

مجموعی طور پر جس طرح وادی کشمیر کے مسلم افسانہ نگاروں نے اپنے تحریروں میں بنتِ کشمیر کے درپیش مسائل کو پیش کیا ہے بالکل اسی طرح سے وادی کے غیر مسلم افسانہ نگاروں نے بھی خواتین کے مسائل کا اپنے افسانوں میں اُجاگر کیا ہے جیسے دیپک کنول کا افسانہ "تفتیش" میں عورتوں کے ساتھ جنسی زیاتیوں کے واقعات کی عکاسی کی ہے۔اس کہانی کے دو کردار شہباز اور بلقیس متوسطہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔دونوں دنیا وفہیا سے بے خبر اپنی سادہ زندگی گزارتے تھے لیکن وادی کشمیر کی افراتفری کی جو ہوا چلی وہ دور دور تک پھیل گئی شہباز اور بلقیس بھی ان حالات کے شکار ہوئے۔بلقیس کی عزت اُس وقت نیلام ہوگئی جب سرحد پار کے تینوں جوان شہباز کے گھر میں زبردستی گھس کر دونوں میاں بیوی پر مخبری کا الزام لگاتے ہیں اسی تفتیش کے آڑ میں وہ تینوں جوان بلقیس کی عزت کو تار تار کرتے رہیں۔اگرچہ زیر نظر کہانی میں وادی کے شورش زدہ دور میں خواتین پر ہونے والے مظالم کا جائز پیش کیا ہے لیکن انہوں نے اس کہانی میں اصل مجرم کی پہچان کرانے کے بجائے جانبداری کا مظاہرہ کرکے سرحد پار کے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا ہے کہ سرحد پار سے جو دہشت گرد آتے ہیں وہ کشمیری لوگوں کی مدد کرنے کے بجائے وہاں کے معصوم عورتوں کو اپنی جنسی ہوس کو پورا کرنے کے لیے آتے ہیں اور پھر وہ اپنی اس ناجائز کام کو جہاد کا نام دیتے ہے:

> ان تین بھیڑیوں نے تفتیش کی آڑ میں اس سے نوچ ڈالا تھا۔اس سے لہو لہان کر دیا تھا۔اس کی عزت وعصمت کی دھجیاں اڑائی تھیں۔اپنی بھوک مٹانے کے لیے انہوں نے اس کا حال بد کر دیا تھا۔۔۔۔اوپر سے یہ دین دار کی باتیں کرتے ہیں اور خود کو مسلمان کہتے ہیں اور کام لادینوں کا کرتے ہیں۔۸

اگرچہ دونوں فرقوں کے تخلیق کاروں نے وادی کشمیر کی امن وامان کی خراب صورت حال میں جنسی استحصال اور جنسی زیادتی کے مسئلے کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا ہے کہ ریاست میں جنسی تشدد روزانہ کا معمول بن گیا ہے اور وادی کشمیر کے ماں، بہن، اور بیٹیوں کا وقار پوری طرح مجروح ہو کر رہ گیا ہے۔اس طرح کے پُر آشوب حالات میں خواتین مسلسل خوف ودہشت کے عالم میں جی رہی ہیں اور ان کو گھر سے باہر نکلنا بہت زیادہ دشوار ہو گیا ہے ان کی عزت وعصمت گھر میں بھی محفوظ نہیں ہے۔اس طرح وادی کشمیر کے معاصر مسلم اور غیر مسلم افسانہ نگاروں نے کشمیری خواتین پر کیے جانے والے ظلم وبربریت کو اپنی کہانیوں میں بیان کیا ہے تاہم غیر مسلم افسانہ نگاروں نے وادی کے پُر آشوب متاثرہ خواتین کی مذکورہ بالا اضطرابی کیفیات کا ذمہ دار سرحد پار کے مسلمانوں کو ٹھرایا ہے۔لیکن اگر دونوں فرقوں کے افسانہ نگاروں کے کہانیوں کو تاریخ کے آئینے میں دیندارانہ تجزیہ کیا جائے تو مسلم افسانہ نگار حقیقت سے بہت قریب لکھتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔کیوں کہ وادی کشمیر میں جدوجہد آزادی شروع ہونے کے بعد کشمیری خواتین ظلم وجبر کا شکار بنتی رہیں ہیں جس کا بنیادی مقصد خوف ودہشت پیدا کرنا اور احتجاج ومزاحمت کی روح کو توڑنا ہے۔اس لیے قابض فوج ہزاروں خواتین اور کمسن

بچیوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ ظلم وجبر کا ایسا طریقہ کار ہے جہاں ہمت و حوصلہ پست کرنے کے لیے اغوا اور عصمت دری کی پالسی اپنائی جاتی ہے جس کی وجہ سے پچھلے تیس سالوں سے وادی کشمیر میں عورتیں ظلم وجبر کا بُری سے شکار ہورہی ہیں۔ سرکاری اہلکاروں اور سیکورٹی عملے کی زیاتیوں نے کشمیر میں خواتین کی زندگی کو جہنم زار بنادیا ہے۔

مذکورہ بالا بحث کو مد نظر رکھتے ہوئے جب ہم جموں وکشمیر مسلم اور غیر مسلم افسانہ نگاروں کی کہانیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وادی کشمیر کے بیشتر تخلیق کار بلاخوف وتردد اور مصلحت پسندی کے قلم کا صیح حق ادا کر رہے ہیں۔ وادی کشمیر پچھلے کئی دہائیوں سے جس پُر آشوب دور سے گزر رہا ہے۔ غلاموں کی زنجیروں میں جھکڑی کشمیری قوم مسلسل ظلم وناانصافی اور جنسی استحصال کے خلاف احتجاج ومزاحمت کر رہی ہے۔ وادی کشمیر معاصر افسانہ نگاران سے بے خبر نہیں ہے اس کی عکاسی ریاست کے افسانوی ادب میں پُر درد انداز سے کی گئی ہے۔ وادی کشمیر کے تخلیق کار سماجی، معاشی، عدم مساوات کے خلاف اپنی آواز بلند کر رہے ہے وہ سیاسی بے رہ روی اور رجعت پسندانہ رویوں کے خلاف اپنی تحریروں کے ذریعے ایک آن دیکھی لڑائی لڑ رہے ہے، بھائی چارے، اخوات اور مذہبی رواداری کی عظمت کو آگئے بڑھا رہے ہے۔ وادی کے افسانہ نگار انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے احتجاج کو دنیا تک پہنچانے کے لیے افسانہ کو وسیلہ اظہار بنایا ہے کہ وادی کشمیر کے حالات وواقعات کی صیحح ترجمانی ہو وہ اپنے کوششوں میں کامیاب نظر آرہے ہیں۔ تاہم وادی کشمیر کے کچھ غیر مسلم افسانہ نگار ایسے ہیں جنہوں نے اپنے ارگرد کے حالات وواقعات کو یکسر نظر انداز کر لیا ہے۔ یہ افسانہ نگار سرکاری سرپرستی وسرکاری انعامات کے خاطر اپنی تحریروں کو سرکاری بیانیے کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ ایسی کہانیوں کو ادیبوں کی قلمی بددیانتی اور جانبداری کا پروپگنڈہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شبنم قیوم، آزادی کی تلاش (افسانوں کا مجموعہ)، (سرینگر: وقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۱۶۔

۲۔ نور شاہ، کشمیر کہانی، (سرینگر: پبلشرز، ۲۰۱۴ء)، ص ۹۷۔

۳۔ ویریندر پٹواری، لالہ رُخ (پچاس منتخب افسانوں کا مجموعہ)، (دہلی: آفیسٹ پرنٹرز، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۰۵۔

۴۔ دیپک بدکی، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (جلد دوم)، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۰۵۔

۵۔ ریاض توحیدی، کالے پیڑوں کا جنگل (افسانوں کا مجموعہ)، (سرینگر: میزان پبلشرز، ۲۰۱۱ء) ص ۸۰۔

۶۔ نور شاہ، کشمیر کہانی، ص ۱۷۔

۷۔ ریاض توحیدی، کالے پیڑوں کا جنگل، ص ۵۶۔

۸۔ دیپک کنول، برف کی آگ (افسانوں کا مجموعہ)، (ممبئی: جواہر پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص ۴۷۔

ماحصل

اس مقالے میں ریاست جموں وکشمیر کے معاصر اردو افسانہ نگاروں کو،،افسانوی ادب،، کے تناظر میں فکری سطح پر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ادیب چونکہ معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہوتا ہے اس لیے وہ معاشرے کے حالات عام انسانوں کے مقابلے میں چیزوں کو زیادہ گہرائی سے دیکھتا ہے۔مورخ بھی حالات وواقعات پر نظر رکھتا ہے لیکن مورخ اور ادیب میں فرق یہ ہے کہ مورخ عام طور پر صرف حالات وواقعات کو جمع کرتا ہے جب کہ ادیب لوگوں کی نفسیات اور ان کے احساسات کا بھی تجزیہ کرتا ہے اور عصری عہد کو اپنی تخلیقات میں سمٹینے کی کوشش کرتا ہے۔دنیا کے مختلف اقوام کی تاریخ میں بڑے بڑے حادثات رونما ہوئے ہیں جن سے قوم عارضی طور پر شکست خوردہ نظر آتی ہے۔لیکن جب وہ قوم کوئی انقلابی قدم اُٹھاتی ہے اور اپنے حقوق کی سربلندی کے لیے کوشش کرتی ہے تو ادیب بھی تخلیقی اعتبار سے اس تحریک میں شامل ہو جاتا ہے وہ قوم کے احساس کو جھنجھوڑتا ہے اور قوم کو ان کی خوبیوں اور خامیوں کا آئینہ دکھاتا ہے۔

زیر نظر تحقیق میں وادی کشمیر کے موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے لیے پہلے مسلم افسانہ نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے پھر غیر مسلم افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور آخر میں ہندو اور مسلم فکر کی تناظر میں ریاست جموں وکشمیر کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کسی بھی تخلیق میں عصری صورت حال کا احساس کسی نہ کسی صورت میں قاری کے سامنے منکشف ہو جاتا ہے۔جموں وکشمیر کے عصری عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔وادی کشمیر کے افسانوی ادب پر جو رومان پرور فضا چھائی ہوئی تھی اس کی چاسنی اُس وقت ختم ہو گی جب ۱۹۹۰ سے وادی کشمیر میں آگ اور خون کا نہ رُکنے والا سلسلہ جاری ہوا اور جس کی وجہ سے وہاں کا نظام زندگی درہم برہم ہو گیا۔جن لوگوں کے ہونٹوں پر پیار و محبت کے گلابی گیت ہوتے تھے اُن کی سوچ پر کراس فائرنگ، گمشدگی، کریک ڈاون وغیرہ جیسی جنگی قسم کی خوفناک کی اصلاحیں اور الفاظ چھا گئے۔اس شورش زدہ دور نے وہاں کے افسانوں ادب کو بھی متاثر کیا اور اس میں ظلم و تشدد مار دھاڑ ،دکھ درد اور خواف وہراس کا اظہار معاصر افسانوں میں صاف صاف نظر آنے لگا۔جب ہم وادی کشمیر کے معاصر مسلم افسانہ نگاروں کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں تو ان میں مجموعی طور پر جو تجرباتی فضا چھائی ہوئی ہے وہ ہے خوف کی فضا یعنی "خوف" کشمیر کے معاصر اُردو افسانے کا تخلیقی استعارہ بن گیا ہے۔

وادی کشمیر کی بدامنی اور موت کی جاری رقص سے ہر افراد میں جنم لینے والی بے چینی اور پیدا ہونے والے خوف کو بھی معاصر مسلم مسلم افسانہ نگاروں نے آشکار کیا ہے۔ انسان گھر سے رخصت ہوتے وقت گھر والے اس کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں اور ان کے واپس آنے تک بے چین رہتے ہے۔ اس میں معاصر افسانہ نگاروں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ خوف وادی کشمیر کے ہر شخص کے لیے ذہنی مرض بن چکا ہے یعنی خوف ہر جگہ ان کا پیچھا کر رہا ہیں۔

وادی کشمیر پر لکھے گئے معاصر افسانوں میں ایک موضوع استحصال ہے جو بھارتی فوج نے وادی کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر کے اہل کشمیر کو بنیادی حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ وادی کشمیر کے مسلم افسانہ نگاروں نے اپنے تحریروں کے ذریعے دکھایا ہے کہ کس طرح راکشسوں نے اپنے ظلم و ستم سے کشمیری لوگوں کا جینا دو بھر کر رکھا ہے۔ وادی کشمیر پچھلے کئی دہائیوں سے جہاں ایک طرف ایک لاکھ سے زیادہ کشمیری لوگوں کو ابدی نید سلائے گئے وہاں دوسری جانب اسکولی بچوں کو بھی آگ برستی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ نوجوانوں کو اغوا کر کے لاپتہ کر دیا جاتا ہے اور بعد میں بڑی بے دردی سے توہین آمیز انداز میں لاشیں پھینک دی جاتی ہیں۔ وادی کشمیر کی اسی صورت حال نے وہاں کے ہر فرد کے نفسیات کو متاثر کیا ہے۔ ظلم و ناانصافی نے نہ جانے کتنے معصوم نوجوان لوگوں کو وہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جس کے ہر موڑ پر کانٹوں کا جال بچھایا گیا ہے۔ ہزاروں نوجوان منزل کی تلاش میں راستے میں قربانی دے گئے۔ لیکن ان قربانیوں کے باوجود بھی ان حکمرانوں کے کانوں پر کبھی جوں تک نہیں رینگی۔ الٹا کشمیریوں پر ظلم و ستم کے نئے ہتھکنڈے ایجاد کئے گئے۔

جموں و کشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں نے اپنے احتجاج کو معاشرے تک پہنچانے کے لیے افسانوی ادب کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔ انہوں نے اپنے گرد و نوح میں لوگوں کو جس ظلم و تشدد سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ اس کی تصویریں ہمیں ان کے افسانوں میں پورے خلوص، دردمندی اور دکھ کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح وادی کشمیر میں ہر طرف گلوں کو کچلا جا رہا ہے۔ کتنے پھول ہے جو کھلنے سے پہلے مرجھا گئے ہیں۔ وادی کشمیر کی بے بس اور لاچار مائیں ایسی ہے جن کی کوکھ ہی اجڑ چکی ہے اولادیں جنے کے باوجود وہ اپنے لخت جگروں کی ایک جھلک دیکھنے کو تڑپ رہیں ہیں۔ اولادوں کی جدائی میں ان کا ایک ایک پل درد اور تڑپ میں گزرتا ہے ہر آہٹ اور ہر آواز پر کشمیری مائیں چونک پڑتی ہے کہ ان کے لخت جگر گھر واپس آ گئے۔ اس تناظر میں حساس قلمکاروں کا وادی کے کرب کو پیش کرنا فطری ہے فرق صرف اتنا ہے کسی کا لہجہ شدت اختیار کرتا ہے اور کسی کا لہجہ مدھم ہے، کوئی اشاروں اور کنایوں میں بات کہہ جاتا ہے کوئی واضح طور پر مگر سچ تو یہ ہر صریر خامہ نوحہ نوحہ کناں ہے۔

اس استحصال کی ایک صورت جنسی استحصال ہے۔اس موضوع کو بھی معاصر مسلم افسانہ نگاروں نے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔افسانہ نگاروں نے ہمیں دکھایا ہے کہ کس طرح وادی گُلپوش میں خواتین کے جنسی استحصال کو ریاستی پالیسی کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔وادی کشمیر کی متنازعہ صورت حال کے پیش نظر کشمیر کی خواتین ظلم وجبر کا شکار بنتی رہی ہیں جس کا بنیادی مقصد دہشت پیدا کرنا اور احتجاج کی روح کو توڑنا ہے۔اور اس کے لیے بیشتر خواتین کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔یہ ظلم وزیادتی کا ایک ایسا طریقہ کار جہاں حوصلہ پست کرنے لیے اغوا اور آبروریزی کی حکمت عملی اپنائی جاتی ہے۔مسلم افسانہ نگاروں نے قوم کے ان حکمرانوں کا چہرہ بے نقاب کیا ہے جنہوں نے اپنے اقتدار کے خاطر قابض فوج کو کشمیری عوام پر ظلم وجبر کرنے اور خواتین کی بے حرمتی کرنے کی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔وادی کشمیر میں ہزاروں خواتین ایسی ہے جنہیں آج تک انصاف نہیں ملا انہیں طاقت کے بل پر ڈرایا دھمکایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی ہونٹ سی لیتے ہیں وہ اپنا غم ظاہر کرنے کے بجائے خاموش رہ کر زہر کے تلخ گھونٹ پیتے رہے ہیں۔یہ وہاں کے معاصر مسلم افسانہ نگاروں کی تخلیقی جرآت مندی کا بین ثبوت ہے کہ انہوں نے اس پُرآشوب دور میں بھی سیاست کی فریب کاری، بے لگام طاقت کی حیوانیت اور کرب ریزی وغیرہ مسائل ومعاملات کو تخلیقی ترجیحات کا جامہ پہنادیا۔چونکہ ان ادیبوں نے خود ان حالات کو جیا اور ستم رسیدہ حالات وواقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ان کے قلم سے سیاہی کے بدلے خون ٹپکتا ہوا نظر آرہا ہے اس کی ایک اہم وجہ وادی کشمیر میں ہندوستان کی جارحیت، تہذیبی، منافرت، مذہبی تعصب اور سیاسی وفوجی یلغار ہے۔وادی کشمیر میں پچھلے پچیس برسوں سے جو مذاحمتی ادب (افسانے) تخلیق ہوا ہے اس کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وادی کے بیشتر تخلیق کار بلاخوف وتردد اور کسی مصلحت پسندی کے قلم کا صحیح حق ادا کررہے ہیں۔یہ افسانہ نگار سماجی ومعاشی، عدم مساوات کے خلاف اپنی آواز بلند کررہے ہیں۔وہ سیاسی بے روی اور رجعت پسندانہ رویوں کے خلاف اپنی تحریروں کے ذریعے ایک آن دیکھی لڑائی لڑرہے ہے، بھائی چارے، اخوات اور مذہبی رواداری کی عظمت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔وادی کشمیر کے مسلم افسانہ نگاروں نے نہ صرف جموں وکشمیر پر چھائی ہوئی دہشت گردی، ظلم وبربریت اور مکر وفریب کی تاریکوں کی تصویر کشی کی ہے بلکہ انھوں نے جموں وکشمیر کے عوام کو ایک نئے سورج کے طلوع ہونے کا خواب بھی دکھایا ہے تاکہ جموں وکشمیر میں پھیلی ہوئی اندھرے کا خاتمہ ہوسکے اور اُس زمین کے باسیوں کو عذاب کے دنوں اور وحشت کے راتوں سے نجات مل سکے۔

غیر مسلم افسانہ کے حوالے سے ریاست جموں وکشمیر کی فکری ونظری مباحث کا مطالعہ زیر نظر تحقیق کا حصّہ ہے۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے نگاری کا آغاز ہی غیر مسلم افسانہ نگاروں سے ہوا ہے۔وادی کشمیر پچھلے کئی

دہائیوں سے ایک ایسی صورت حال کی گرفت میں ہے۔ جہاں تشدد اور احتجاج کا غلبہ ہے گزشتہ پانچ دہائیوں سے جاری وسیع پیمانے پر جاری سرکاری ظلم وناانصافی اور قتل وغارت گری نے اور اس کی مزاحمت میں چلنے والی عسکری اور پر امن دونوں اقسام کی عوامی جدوجہد نے کشمیر کے لوگوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس شورش زدہ دور کو دیکھ کر وادی کشمیر کے ہندوؤں پنڈتوں کو عدم تحفظ کا احساس ہونے لگا اس بنا پر انہوں نے اُس وقت (۱۹۹۰ء) کے گونر جگموہن کے اشارے پر وادی گُلپوش سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگیے۔ اس تناظر میں دیکھے تو وادی کشمیر کے غیر مسلم افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں میں ہجرت کے اس الم ناک حادثے کو موضوع بحث بنا کر عالم انسانیت کے سامنے ایک سوال کھڑا کیا۔ سوال آخر یہ کہ انہیں اپنے ہی آبائی وطن میں رفوجی کیوں بننا پڑا؟ ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے جس چیز کا زیادہ احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ وطن سے دور مہاجرت کی خاک چھاننے والوں نے زندگی کے اس بن باس میں صرف اپنے پیاروں کو ہی نہیں کھویا بلکہ وہ خود بھی اپنے خدوخال اور حسن ورعنائی سے محروم ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے آبائی وطن سے دربدی، اپنے عزیزوں وواقارب سے جدائی، اپنی مٹی کی خوشبو سے محرومی اور اپنی تہذیب وتمدن سے کٹ جانے کا احساس اس موضوع پر لکھے گئے افسانوں میں روپ بدل بدل کر سامنے آیا ہے۔ ان کے افسانوں میں اپنے وطن سے جدائی اور ہجرت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان کا ہر افسانہ چیخ چیخ کر وادی کشمیر کی بربادی کی تاریخ بیان کرتا ہے۔

مقالہ ہذا میں معاصر ہندو اور مسلم فکر کے تناظر میں ریاست جموں کی صورت حال کو سمجھنے کی سعی کی۔ جب ہم وادی کشمیر کی موجودہ صورت حال کو معاصر ہندو اور مسلم افسانہ نگاروں کے افسانوی ادب کے تناظر میں دیکھتے ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وادی کشمیر پچھلے کئی دہائیوں سے جس آگ میں جلس رہی ہے کچھ افسانہ نگار اس سے جنگ آزادی سے منسوب کرتے ہیں، اور کچھ دہشت گردی سے۔ وادی کشمیر کے غیر مسلم افسانہ نگاروں نے کشمیر کی تحریک آزادی کو دہشت گردی سے جوڑ کر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ تحریک آزادی نہیں بلکہ یہ دہشت گردی کی تحریک ہے۔ ریاست کی غیر مسلم افسانہ نگاروں کی طرف سے بے اعتنائی کی وجہ شاید ان تخلیق کاروں کی سرکاری انعام اور ایواڑ کے حصول کے خاطر اپنی تحریروں اور کہانیوں کو سرکاری بیانئے کے مطابق ڈھالتے ہے۔ اس لیے یک طرف بول کر اصل مجرم کی پہچان کرانے کے بجائے اُلٹا سرحد پار الزام لگایا ہے کہ یہ جدوجہد کشمیریوں کی جدوجہد نہیں ہیں بلکہ سرحد پار کی دہشت گردی ہے اور اس کی پشت پر پاکستان ہے اور یہ سب پاکستان کروا رہا ہے۔

کشمیری خواتین کے جنسی استحصال کو ریاست جموں وکشمیر کے دونوں فرقوں کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ تاہم وادی کے کچھ غیر مسلم افسانہ نگار ایسے ہے جنھوں نے جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے

مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا ہے کہ سرحد پار سے جو دہشت گرد آتے ہے وہ کشمیری لوگوں کو مدد کرنے کے بجائے وہاں کے معصوم عورتوں کو اپنی حوس کو پورا کرنے کے لیے آتے ہیں اور پھر اپنی ناجائز کام کو جہاد کا نام دیتے ہے۔ جب کہ وادی کشمیر کے مسلم افسانہ نگاروں نے اس صورت حال کو شدت سے محسوس کیا اور اصلی مجرم کی شناخت بھی کروائی ہے کہ انڈین فوج وادی کشمیر میں عصمت دری کو جنگی حربے کے طور پر استعمال کر رہیں ہیں اور آزادی کی جدوجہد کو دبانے کے لیے خواتین کو نشانہ بنا رہی ہیں۔

وادی کشمیر کے غیر مسلم افسانہ نگاروں نے کشمیری ہندوؤں پنڈتوں کی نکل مکانی کو بھی غیر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کر کے مکمل طور پر اس کی غلط عکاسی کی ہے۔ حقیقت کے بجائے انھوں نے کشمیری ہندوؤں پنڈتوں کی نکل مکانی کو کشمیر کے مسلم اکثریت کے ڈر اور خوف سے منسوب کیا ہے۔ چونکہ یہ افسانہ نگار ہندوؤں طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے مذہب کو بنیاد بنا کر حقیقت سے مُنہ موڑ کر چھوٹ کا پلندہ کھڑا کیا کہ حریت پسند اپنے مفادات کے خاطر صرف خون کرنا جانتی ہیں ان ہی کی وجہ سے کشمیری ہندوؤں پنڈتوں کا قتلِ عام ہوا، ان ہی کی وجہ سے کشمیری ہندوؤں پنڈتوں کو گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کیا۔ جب کہ وادی کشمیر کے مسلم افسانہ نگاروں نے بڑی بے باکی کے ساتھ قوم کے حقائق اور مسائل کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ انھوں اُس وقت کے سیاست کا چہرہ بے نقاب کیا ہے جنھوں نے اپنے اقتدار کے خاطر سینکڑوں سال مشترکہ تہذیب اور ہندو مسلم بھائی چارگی کو ختم کر دیا۔

مآخذ

بٹ، خواجہ محمد بشیر۔جموں و کشمیر کی درد ناک تصویر۔لاہور: حنیف پرنٹرز، ۲۰۱۶ء۔

بدکی، دیپک۔چنار کے پنجے (افسانوں کا مجموعہ)(پہلا ایڈیشن، مجلد)۔دہلی: ایجوکیشنل پبشنگ ہاوس، ۲۰۰۵ء۔

بدکی، دیپک۔زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (جلد دوم)۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۸ء۔

پٹواری، ورندر۔لالہ رخ (پچاس منتخب افسانوں کا مجموعہ)۔دہلی: آفیسٹ پرنٹرز، ۲۰۱۳ء۔

پریمی، برج۔جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشوونما۔جموں: رچنا پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء۔

توحیدی، ریاض۔کالے دیوؤں کا سایہ (افسانوں کا مجموعہ)۔سرینگر: میزان پبلیشرز، ۲۰۱۴ء۔

توحیدی، ریاض۔کالے دیو و ں کا سایہ۔سرینگر: میزان پبلشرز، ۲۰۱۴ء۔

توحیدی، ریاض۔معاصر اردو افسانہ (تفہیم و تجزیہ)(جلد اول)۔دہلی: روشسان پرنٹرس، ۲۰۱۸ء۔

توحیدی، ریاض۔کالے پیڑوں کا جنگل (افسانوں کا مجموعہ)۔سرینگر: میزان پبلیشرز، ۲۰۱۱ء۔

جاوید، قدوس۔"جموں کشمیر میں اردو افسانے کے بدلتے رجحانات"۔مشمولہ شیرازہ ۵۲ (نومبر-دسمبر ۲۰۱۴ء)، ص ۷-۱۵۔

سالک، سلیم۔جموں کشمیر کے منتخب اردو افسانے (پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک)۔ سرینگر: میزان پبلشرز، ۲۰۱۱ء۔

سروری، عبدالقادر۔کشمیر میں اردو (جلد سوم)۔سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۱۹۸۲ء۔

سروری، عبدالقادر۔کشمیر میں اردو (جلد دوم)۔سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۱۹۸۴ء۔

شاہ، نور۔کشمیر کہانی۔سرینگر: میزان پبلیشرز، ۲۰۱۴ء۔

شاہ، جاوید اقبال۔دیپک بدکی کی افسانہ نگاری۔سرینگر: میزان پبلشرز ۲۰۰۹ء۔

شاہ، نور۔جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار۔سرینگر: میزان پبلشرز، ۲۰۱۱ء۔

علی، لیاقت۔جموں و کشمیر میں اردو ادب (۲۰۰۰ سے ۲۰۱۳)۔دہلی: ایم۔آر پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء۔

قریشی، عرفان احمد۔ رینزو شاہ کے افسانوں کا تحقیقی مطالعہ۔ سرینگر: گلشن بکس، ۲۰۱۱ء۔

قیوم، شبنم۔ آزادی کی تلاش۔ سرینگر: وقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء۔

قیوم، شبنم۔ یہ لہو کشمیر کا ہے یہ کشمیر مرا۔ دہلی: بھارت پرنٹرز، ۲۰۱۶ء۔

قیوم، شبنم۔ آزادی کی تلاش (افسانوں کا مجموعہ)۔ سرینگر: وقار پبلی کیشنز، ۲۱۱۵ء۔

قیوم، شبنم۔ کشمیر میں عورتوں کی بے حرمتی۔ سرینگر: وقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء۔

کشمیری، حامدی۔ ریاست جموں میں اردو ادب۔ سرینگر: گلشن پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء۔

کنول، دیپک۔ برف کی آگ (افسانوں کا مجموعہ)۔ ممبئی: جواہر پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء۔

گیلانی، سید علی۔ ولر کنارے (جلد دوم)۔ سرینگر: ملت پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

مہجور، نعیمہ احمد۔ دہشت زادی۔ سرینگر: میزان پبلیشرز، ۲۰۱۲ء۔